یادشِ بخیر

قلمی خاکے (مضامین)

فاطمہ عالم علی

حصّۂ اوّل

"شخصیات"

اشاعت ـــــــــ جولائی سنہ ۱۹۸۹ء

تعداد ـــــــــ ۵۰۰

قیمت ـــــــــ ۱۵ (پندرہ روپے)

ملنے کا پتہ

فاطمہ عالم علی

مکان نمبر 8-2-332/7

روڈ نمبر ۳ - بنجارہ ہلز

حیدرآباد - 34

فون 248795

پیارے[1] اباّ کے مدّاحوں اور چاہنے والوں کے نام

جن کے خلوص، پیار اور اپنائیت بھرے برتاؤ نے پتھریلے
اور حوصلہ شکن ماحول میں مجھے باحوصلہ رکھا ——

فاطمہ عالم علی

[1] قاضی محمد عبد الغفار مرحوم ایڈیٹر "پیام" مصنف "لیلیٰ کے خطوط"، روزنامچہ، حیاتِ اجمل، آثارِ جمال الدین افغانی، آثارِ ابوالکلام، سیب کا درخت، تین پیسے کی چھوکری، اس نے کہا، عجیب، نقشِ فرنگ۔

پیشِ لفظ

زیرِ نظر کتاب کے تقریباً تمام مضامین فرمائش پر لکھے گئے ۔
حبیب علاؤ الدین مرحوم جائنٹ ایڈیٹر "مِلاپ" کی فرمائش پر "ابا" کے ساتھ چند لمحے" لکھا۔ حبیب صاحب بہت خوبیوں کے انسان تھے اکثر یاد آجاتے ہیں ۔ یہ مضمون "صبا" میں چھپ کر کراچی پہونچا۔ اکرام احمد صاحب (غالباً مراد آباد کے رہنے والے ہیں) اس مضمون کو دیکھ کر مجھے لکھا کہ "سر یعقوب" پر بھی مجھے لکھنا چاہیئے ۔ اس طرح "میرے ماموں میاں" وجود میں آیا۔ جناب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب کے حکم پر "مخدوم صاحب" لکھا گیا۔ کچھ مضامین آل انڈیا ریڈیو کے لئے لکھے ۔ کچھ تعزیتی جلسوں میں لکھے گئے ۔ غرض خود قلم لے کر بیٹھنے کی توفیق کبھی نہ ہوئی ۔

سنہ ۱۹۶۱ء سے سنہ ۱۹۷۳ء تک خوب لکھا جس کے لئے میں اُردو ہال کی ادبی محفلوں کی ممنون ہوں ۔ کتابت وطباعت کا سلسلہ ایک سال تک جاری رہا۔ اس میں ہمارے کیلی گرافر محمد محمود صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ مدعی سست اور گواہ چست والا معاملہ رہا ۔ باوجود محمود صاحب کے مسلسل تقاضوں کے ہم نے کبھی وقت پر مضمون تصحیح کر کے نہیں دیا —— ! اب ان کا کیا دوش ۔ ! محمود صاحب بے حد شریف اور بامروت نوجوان ہیں ۔ بڑی دیانت داری کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھاتے ہیں۔ موجودہ ماحول میں محمود صاحب جیسے لوگوں کا بس اللہ ہی نگہبان ہے !
جس شکل میں کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اس کو محمود صاحب کی محنت کا نتیجہ سمجھیے جس کے لئے میں اُن کی ممنون ہوں اور دُعا گو بھی کہ اللہ پاک اُن کو دین و دنیا دونوں میں سرفراز رکھے ، (آمین)

فاطمہ عالم علی

میرے ماموں میاں

انسان جب تک زندہ رہتا ہے اس کی زندگی واقعات سے بھرپور رہتی ہے اور جب ختم ہوتا ہے یہی واقعات کہانی بن جاتے ہیں ۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ مرنے والے کی زندگی سے صرف اسی کی کہانی بنتی چلی جاتی ہے لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک کہانی سے کئی کہانیاں وابستہ ہوجاتی ہیں ۔ ایسی ہی ایک کہانی سر یعقوب نے بھی چھوڑی ہے ۔ جب تک زندہ رہے اپنی زندگی کے نور سے نہ جانے کتنے دلوں اور کتنے گھروں کو منور کرتے رہے اور جب ایک دن اچانک ختم ہوئے تو ان دلوں اور گھروں کو بھی ہمیشہ کے لئے بے نور کر گئے ' بس کہانیاں باقی رہ گئیں ۔

سر یعقوب نے علیگڈھ سے بی ۔ اے اور ایل ایل بی پاس کیا اور مرادآباد میں وکالت شروع کی ۔ ان کا شمار کامیاب وکیلوں میں کیا جاتا تھا ۔ علیگڈھ یونیورسٹی میں اپنی وطن پرستی کی وجہ سے "قوم" کہلاتے تھے ۔ ان کے خیالات سر سید کے خیالات کا پرتو تھے یعنی جس طرح زمانے کے حالات کے پیش نظر موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے سر سید نے انگریز حکومت کا ساتھ دینا مناسب سمجھا تھا اسی طرح سر یعقوب نے محسوس کیا کہ جب تک حاکم وقت کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے قوم کی ترقی اور بہتری کے راستے کٹھن ہوتے جائیں گے چنانچہ اسی قوم پرستی کے جذبے نے وکالت چھڑا ای ٹھکانے سے بے ٹھکانہ کیا اور انگریز سرکار میں اپنا مقام پیدا کیا ۔ عرصہ تک وہ مجلس مقننہ کے رکن رہے پھر نائب صدر اور اس کے بعد صدر ہوئے اس عرصے میں انھوں نے قوم کی بھلائی کے کئی کاموں کو حکومت سے منوایا ۔ مثلاً خلع کا قانون بنوانا اور منوانا ان کا اہم کارنامہ ہے ۔ اس کے بعد سر یعقوب کونسل آف اسٹیٹ اور مرکزی مقننہ کے ممبر ہوئے میرا خیال ہے اسی زمانے میں ان کو سر کا خطاب ملا تھا ۔

سر یعقوب کچھ عرصہ مسلم لیگ سے بھی وابستہ رہے ان کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ مسلمان تعلیمی

اور معاشی حیثیت سے اپنے ہم قوموں میں بہت پیچھے ہیں۔ ہندوؤں میں تعلیم کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور اپنے
پیروں پر کھڑے ہونے کا شعور بیدار ہو چکا تھا لیکن مسلمان اپنی ضعیف الاعتقادی کے ہاتھوں تباہ تھے۔
جسطرح کسی خاندان کی ترقی خاندان کے ہر فرد کی ترقی پر منحصر ہے اور کسی ایک فرد کی کمزوری سے پورے
خاندان کی تباہی کا اندیشہ ہوتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی کمزوری پوری قوم کے لئے نقصان دہ ثابت
ہو سکتی تھی اور اسی احساس و جذبے نے انکو مسلم لیگ میں شرکت پر اکسایا ۱۹۳۷ء میں جب لکھنؤ میں
کل ہند مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو سر یعقوب معتمدی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

ان سے جو کچھ ہو سکا قوم کیلئے کیا لیکن قوم نے قدر نہ کی۔ کبھی ٹوڈی بچہ کہا گیا اور کبھی قوم پرستی کے
مخلص جذبہ کو ذاتی اغراض سے وابستہ کیا گیا یا نام نمود کا رسیا کہا گیا لیکن سر یعقوب نے ان تلخ باتوں کو
سنتے اور شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتے۔ اخباروں میں انکے کارٹون چھپتے تو اسقدر لطف اٹھاتے کہ
فریم کر کے ڈرائنگ روم میں سجا دیتے کسی قومی اخبار میں انکی ہجو چھپتی تو اسکو بھی کمرے کی زینت بنا دیتے
اور اخبار کو شکریہ کا کارڈ بھیجنا کبھی نہ بھولتے۔

سر یعقوب نے سب تو ہنسی خوشی برداشت کر لیا لیکن ملک کی تفریق کا خیال ان جیسے صلح پسند انسان
برداشت نہ کر سکے اور جب پاکستان کے متعلق سوچا جانے لگا تو جس مقصد کے لئے وہ مسلم لیگ میں
شریک ہوئے تھے وہ دم توڑتا نظر آیا اور انھوں نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جب ہر شخص نے ڈیڑھ
اینٹ کی مسجد الگ بنانے پر تل گیا تو سر یعقوب کی قوم پرستی کا جذبہ بری طرح مجروح ہوا اور انھوں نے
سیاسی میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔

سر یعقوب کی ہر دلعزیزی میں کیا شک جو ان سے ایک بار مل لیتا چاہے ان کا مخالف ہی کیوں نہ
ہو دل میں انکی عظمت کا قائل ہوئے بغیر نہ رہتا۔ انگریزوں کے ساتھ انکا میل جول رکھنے ہم وطنوں کو
شاق گذرتا وہ سمجھتے تھے کہ اتنا اچھا انسان جسکا دل خدمت کے جذبہ سے لبریز ہے کیوں انگریزوں
کے سحر میں مبتلا ہے یا وہ ہر طرح انکو حاصل کرنا چاہتے تھے اور جب سر یعقوب اس میدان سے باہر
نکلے تو سب ہی کے ہاتھ انکی طرف بڑھے لیکن جب نظام حیدرآباد نے انکو بلایا تو انھوں نے

مسلمانوں کی خدمت کے جذبہ کے تحت یہاں آنا پسند کیا۔ حیدر آباد آنے سے دو سال پہلے انکے قلب پر حملہ ہو چکا تھا اور ڈاکٹروں نے زیادہ کام نہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اپنی صحت کے پیش نظر حیدر آباد میں رہ کر خاموش خدمت کو ترجیح دی اور مشیر اصلاحات کی حیثیت سے حیدر آباد آگئے (حقیقت تو یہ ھیکہ یہاں انکی موت کھینچ لائی تھی) بہرحال وہ خوش تھے کہ انکو پھر کچھ کام کرنے کا موقع ملا اور حیدر آباد خوش تھا کہ سر یعقوب ملے چنانچہ بزرگ ہائی کورٹ جج جناب غلام پنجتن چچا نے کہا۔

کل صبح بنکے وہ غارت گر نوم آتے ہیں
چوٹ پر ڈنکے کی آتے ہیں بزعم آتے ہیں
اختلافاتِ سیاسی کو مٹانے کیلئے
سر محمد جنھیں سب کہتے ہیں "قوم" آتے ہیں

سر یعقوب جس قدر و منزلت کے مستحق تھے وہ انکو حیدر آباد میں بھی بلاشبہ حاصل ہوئی نظام نے بھی انکے پر خلوص جذبۂ خدمت کا صلا دل کھول کر عطا کیا۔ انکو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ ملازم سرکار ہیں اُن سے ایسے تعلقات پیدا کئے کہ حاکم و محکوم کا فرق برائے نام رہ گیا اور اسکی جگہ دوستی نے لے لی تقریباً ہر روز سر یعقوب کنگ کوٹھی جاتے کہتے ہیں کہ اُس زمانے میں صرف چند لوگ ایسے تھے جنکی موٹر کو اندر تک جانے کی اجازت ہو اور جنکو کرسی پیش کی جاتی ہو۔ انھی چند میں سر یعقوب کا شمار بھی تھا۔ اکثر رات کو فون پر بات ہوتی۔ ہر دوسرے تیسرے دن کنگ کوٹھی سے خاصہ آنا معمول بنگیا تھا۔ یہاں سے بھی طرح طرح کے کھانے تیار ہو کر نظام کیلئے جایا کرتے تھے جنکا ذکر سر یعقوب کے انتقال کے بعد بھی کئی سال تک حضور اپنی سالگرہ کے موقعہ پر اپنے فرمانوں میں کرتے رہے یہ صرف دو سال حیدر آباد میں رہے لیکن آج بھی ان کی ضیافتوں کے تذکرے سننے میں آتے ہیں جنھوں نے ان دعوتوں میں شرکت کی ہے کہتے ہیں کہ بعض کھانے ایسے کھائے جو نہ پہلے کبھی کھائے تھے اور نہ انکے بعد کبھی دیکھنے میں آئے۔

سر یعقوب کا تعلق مرادآباد کے برگزیدہ خاندان سے تھا انکے اجداد سمرقند سے

آئے تھے۔ اور بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے یہ علماء کا خاندان تھا امور مذہبی اور محکمہ قضات کی اہم خدمات انکے سپرد رہی ہیں۔ لیکن سر یعقوب کے والد مولوی محمد اسماعیل نے وکالت کو ذریعہ معاش بنایا اور شاہجہاں پور میں وکالت کرتے تھے اکلوتے بیٹے یعقوب نے بھی باپ کے نقش قدم پر زندگی کی ابتدا کی تھی۔

سر یعقوب کی پہلی شادی قاضی عبدالغفار کی پھوپی زاد بہن سے ہوئی لیکن وہ ایک سال بھی زندہ نہ رہیں۔ چند سال بعد لاہور کے شمس العلماء مولوی ممتاز علی صاحب کی اور "تہذیب نسواں" والی محمدی بیگم کی صاحبزادی امتیاز علی تاج کی بہن وحیدہ بیگم سے شادی ہوئی۔ یہ اپنے زمانے کی قابل بیویوں میں گنی جاتی تھیں کہتے ہیں صورت شکل کی بہت اچھی تھیں قابلیت سے کسکو انکار ہوسکتا ہے۔ علم و ادب کے گہوارے میں پلی تھیں۔ مراد آباد میں عورتوں کی فلاح کے لئے پہلا قدم انھوں نے ہی اٹھایا، تعلیم نسواں کا سلسلہ جب وحیدہ بیگم نے چھیڑا تو ہر طرف سے ان پر مخالفت کی بوچھار شروع ہوگئی، کیونکہ اس زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم گویا مذہباً ناجائز تھی۔

لیکن یہ بھی دھن کی پکّی تھیں اپنی ہی سسرال کی چند لڑکیوں کو جمع کر کے ایک اسکول کی بنیاد ڈالی جو آج بھی وحیدہ گرلز اسکول کے نام سے چل رہا ہے، یہ بھی بہت مختصر عمر لیکر آئیں چند سال شوہر کے ساتھ گذارے اور دنیا سے سفر کر گئیں۔

محترمہ نذر سجّاد حیدر صاحبہ نے ان پر ایک مرثیہ لکھا تھا جو میری نظروں سے بھی گذرا ایک شعر یاد رہ گیا ہے وہ یوں تھا۔

دنیا میں ابھی آئے تمہیں عرصہ نہ ہوا تھا
کیوں جلد سفر تم نے کیا ہائے وحیدہ

غرض انکی قابلیت اور چند سال کی رفاقت نے سر یعقوب کے دل پر کچھ ایسا نقش چھوڑا کہ وحیدہ بیگم کے بعد کبھی شادی کا خیال نہ کیا اور تمام عمر انکی یاد میں تنہا رہ کر گذار دی۔

ابھی تک تو آپ نے سر یعقوب کے بارے میں سنا اب ذرا میرے ماموں میاں سے بھی مل لیجئے۔

یہ کوئی دوسرے صاحب نہیں بلکہ وہی سر یعقوب ہیں۔ آپ نے وہ مثل تو سنی ہوگی کہ "ماموں کے کانوں بالیاں بھانجی اینڈی بینڈی پھرے" اور وہ مجھ پر صادق آئی ماموں میاں کو تو کبھی شان و شوکت کا احساس نہ ہوا لیکن ہم اس قدر اترائے اور اکڑے کے لقا کبوتر ہو کر رہ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں جتنا بھی اکڑوں کم ہے کیوں کہ یہ صرف میرے ماموں نہیں بلکہ ماں بھی تھے۔

دیکھئے تو کس طرح کہانی میں کہانی نکلتی چلی آتی ہے میں خود بھی حیران ہوں کہ آخر ماموں میاں کی کہانی کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں دماغ میں خیالات کا ہجوم ہے اور انکا ساتھ دینے سے قلم قاصر۔ ایہ وہ کہانی ہے کہ زندگی بھر لکھوں تو ختم نہ ہو انکی زندگی کا ہر لمحہ میرے لئے اہمیت رکھتا ہے ماموں میاں کے حالات زندگی لکھوں اور اپنا ذکر بار بار نہ لاؤں یہ ناممکن سی بات ہے۔ میں حتی الامکان کوشش کرونگی کے جو کچھ لکھوں انھیں پر لکھوں۔

ماموں میاں اپنی دونوں بہنوں سے بڑے تھے میری والدہ ماموں میاں سے چودہ سال چھوٹی تھیں۔ میری خالہ اور خالو انکے ساتھ رہتے تھے انکے ایک لڑکا تھا قاضی صاحب کی پہلی لڑکی زہرہ تھیں اور آخری میں جو بہن سے بارہ سال چھوٹی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان چار بھائی تھے جنکی عمریں زیادہ نہ ہوئیں۔

میری پیدائش کے دس دن کے بعد میری والدہ ۲۸ سال کی عمر میں دنیا سے رحلت کر گئیں، اور اپنی امانتیں اپنے چہیتے بھائی بہن کے سپرد کر گئیں۔ آپا ابّا کی لاڈلی تھیں ابّا سے دور رہنا انکو کسی قیمت پر گوارہ نہ تھا اس لئے وہ تو اپنے والد کے پاس رہیں اور مجھے خالہ ماموں اپنے گھر لے آئے۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ "ماں مرے موسی جیے" لیکن ہماری قسمت میں خالہ کا سکھ بھی نہ تھا۔ میں ابھی صرف چند سال کی تھی کہ ایکدن اچانک (امّاں خالہ کو کہتی تھی) امّاں کہیں چلی گئیں سارے گھر میں، تلاش کے بعد بھی نہ ملیں تو میں نے ماموں میاں سے پوچھا "میری امّاں کہاں ہیں؟" ماموں میاں نے بڑی آہستگی سے کہا "تمہاری امّاں تو مٹّی کی تھیں مٹّی میں مل گئیں"۔ اور کئی دن تک میں یہ عجیب بات ہر آنے جانے والے کو سناتی رہی۔ اسوقت میری عمر مشکل سے چار سال ہوگی لیکن

ماموں میاں کے وہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں اور اب یہ بات کتنی صاف اور واضح ہوگئی ہے کیونکہ خالو ماموں میاں، ابا اور آپا سب ہی مٹی میں مل چکے ہیں۔ "رہے نام اللہ کا"۔

تو اس طرح میں ماموں میاں کے پاس آگئی وہ لاولد تھے ماں کا پیار ماموں نے دیا اور خالہ کا پیار خالو نے اس طرح دیا کہ پھر خالہ یاد نہ آئی میں اپنے خالو ہی کو ابا کہتی تھی ان دونوں نے جس طرح میری پرورش کی وہ انہیں کا حق تھا اکثر سوچتی ہوں کہ اللہ پاک نے ایک ماں لیکر آخر کتنی ماؤں کی مامتا ان کے دلوں میں ڈالدی تھی کہ کسی وقت میری کسی حرکت سے انکی تیوری پر بل نہ آتا میں ضد کرنے کے نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرتی نرالی چیزوں کی فرمائش کرتی نہ فرمائش کا کوئی وقت ہوتا نہ ضدوں کا کوئی موقع لیکن میرے منہ سے بات نکلتی تو ہو کر رہتی دن کو رات کہدیتی تو یہ بھی ہم زبان ہوجاتے اچھے سے اچھے برتن توڑ کر اسکے ٹوٹنے کی آواز سے لطف اٹھاتی تو ماموں میاں برابر کے شریک ہوتے کئی مرتبہ آدھی رات کو چیری اوڑھ کر جھولنے کی فرمائش ہوئی تو اسی وقت پوری کی گئی بیچ رات میں آنکھ کھل جاتی ابا (خالو) کو قریب نہ پاتی تو آفت آجاتی اگر وہ تہجد کا وضو کئے ہوتے تو جان کھا جاتی کہ پہلے جیسا منہ تھا ویسا کیجئے اور وہ چہرے پر راکھ مل کر کہتے دیکھ بیٹی جیسا پہلے تھا ویسا ہوگیا، کہاں تک سناؤں اب تو مجھے بھی وہ گذری باتیں جھوٹ معلوم ہوتی ہیں تو سننے والوں کو یقین کیسے آسکتا ہے لیکن وہ حقیقت تھی۔

میری ان بے جا ضدوں، کے موقعہ پر کبھی میرے والد آجاتے تو بہت الجھتے اور ماموں میاں سے کہتے "یعقوب تم نے اسکی ضدیں اٹھا اٹھا کر اس کا ستیاناس کردیا ہے" یہ جملہ ماموں میاں کے لئے بہت اذیت دہ ہوتا اور وہ جواب دیتے پیارے میاں (گھر کا نام) تم اطمینان رکھو، فاطمہ کی ضدوں سے تکلیف نہ ہوگی وہ ہم سے ضد کرتی ہے تکلیف ہوگی تو ہمیں ہوگی وہ تمہارے پاس ضد کرنے نہ آئے گی۔" ماموں میاں جب پیارے میاں کو اطمینان دلا رہے تھے تو وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ فاطمہ کو منجدھار میں چھوڑ کر ہی جانے والے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے والد سے بہت دور رہی اتنا دور کہ اکثر انکو پہچاننے میں تکلف

جب میں لکھنؤ میں پڑھتی تھی اور بورڈنگ میں رہتی تھی ہر ہفتہ چھٹی پر آپا کے پاس آجاتی تھی
تھی میرے بہنوئی لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ایک بار اسی طرح میں آپا کے پاس آئی ہوئی تھی۔
میں نے چلمن سے دیکھا ایک صاحب معہ سامان کے تانگے سے اتر رہے ہیں میں بھاگی بھاگی اندر گئی
اور آپا سے کہا ایک صاحب آئے ہیں بالکل آپ کے ابّا جیسے ہیں آپا ابّا کا نام سنکر بے قرار ہو کر چلمن کے
پاس پہونچیں اور دیکھا تو پلٹ کر مجھ سے بولیں "چڑیل یہ تو ابّا ہیں تو اپنے ابّا کو بھی نہیں پہچانتی"
میری یہ دوری محض اس لئے تھی کہ میری بے جا حرکتوں پر میرے والد کہیں مجھے ڈانٹ نہ
دیں ماموں اور خالو مجھے یوں چھپائے رکھتے جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں میں سمیٹے رہتی ہے۔
حالت یہ تھی کوئی مجھ سے زور سے بات کرتا تو گھبرا جاتے کہتے آہستہ سمجھا کر بات کرو چیخنے
کی کیا ضرورت ہے۔

میرے ساتھ تو جو کچھ اُن کا طریقہ تھا وہی آپا اور میرے خالہ زاد بھائی (میرے لئے سگے بھائی سے بڑھکر
تھے) کے ساتھ بھی انکا یہی حال تھا۔ آپا جب سسرال سے آتیں تو بڑے اہتمام کئے جاتے جب
تک رہتیں دن عید رات شبِ برات رہتی۔ صبح سے شام تک خاندان کی بیگمات کا آنا جانا لگا
رہتا اور بھائی تو گویا انکے گھر کا چراغ تھے۔

ہملوگوں کے لئے انھوں نے بڑی قربانیاں کیں ہیں۔ ہماری خوشی انکی خوشی تھی، ہمارا دکھ انکا
دکھ تھا انکا ذاتی شاید دکھ تو ہو لیکن خوشی ہم ہی سے وابستہ تھی۔ جب انکو افریقہ کا سفیر بنا کر بھیجے
جانے کا پیشکش کیا گیا تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ میری بچّی ابھی چھوٹی ہے اور
سر رضا علی کا نام دیدیا یہ انکے بچپن سے اسکول اور کالج کے ساتھی تھے دونوں میں بہت
محبت تھی۔

جب ماموں میاں سنہ ۱۹۳۴ء میں ولایت گئے تو میں آپا کے ساتھ حیدرآباد والد کے پاس
آگئی کچھ دن بعد آپا چلی گئیں، اور ابّا نے مجھے روک لیا اور اسکی اطلاع ماموں میاں کو کر دی۔
ماموں میاں بے قرار ہو گئے اور آپا کو لکھا کہ فاطمہ کو سیانے میاں کے پاس چھوڑ کر تم نے

ابّا کے ساتھ گذرے ہوئے چند لمحے

یوں تو مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے اور جی چاہتا ہے کہ کچھ لکھا بھی کروں مگر جی کی نہ پوچھئے وہ تو بہت کچھ چاہتا ہے لکھوں تو جب کہ لکھنا آئے کئی مرتبہ لکھنے کے ارادے سے بیٹھی مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ اپنا لکھا خود پڑھا تو خاک سمجھ میں نہ آیا گھبرا کر یہ ارادہ کر لیا کہ صرف "زبانی لفاظی" پر ہی اکتفا کرنا چاہیئے۔

اب اسے بدقسمتی ہی کہیئے کہ میں نے اپنے اس لکھنے کے شوق کا اظہار اپنے چند دوستوں سے کیا تھا اور سچ پوچھئے تو انھیں لوگوں کے عنایت آمیز اصرار کا آج مجھے شکار بننا پڑا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک یہ خوش فہمی بھی رہی کہ قاضی صاحب کی بیٹی کے ناتے مجھے کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہیئے تاہم بہت جلد یہ خوش فہمی دُور ہو گئی اور یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ اگر باپ ادیب یا صحافی تھا تو ضروری نہیں کہ میں بھی ادب کے میدان میں کود پڑوں صاحب یہ تو اللہ کی دین ہے۔

ابا ہی کو لیجیئے ان کا سارا شجرہ اٹھا کر دیکھ ڈالیئے سیاسی باغی تو ان کے پرکھوں میں ضرور ملیں گے۔ لیکن مصنّف قسم کی کوئی مخلوق نظر نہ آئے گی۔ بہر حال بہت غور و فکر کے بعد آج ابّا کی زندگی کے چند واقعات مضمون کی شکل میں پیش کر رہی ہوں۔ اگر مضمون پسند آجائے تو اسے ابا ہی کا روحانی فیض سمجھئے اور پسند نہ آئے تو مجھے معاف کیجئے۔ میں صرف گیارہ دن کی تھی کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا اور مجھے میرے ماموں محمد یعقوب نے گود لے لیا ان کے کوئی اولاد نہ تھی میں انھیں کے پاس رہتی تھی ابّا کے پاس میرا آنا جانا ایک بے تکلف مہمان کی طرح ہوتا تھا۔ جب ابا حیدرآباد آ گئے تو پھر ان سے دو دو سال ملاقات

ؒ قاضی محمد عبدالغفار۔

نہ ہوتی تھی۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۴۲ء کو اچانک ماموں میاں کا انتقال ہوگیا یہ میری زندگی کا پہلا زبردست حادثہ تھا۔ ماموں میاں کے انتقال کے بعد ہم پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم" کے مصداق یوں سمجھئے کہ میں دوبارہ ابّا کے گھر پیدا ہوئی اور یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں۔

ہاں تو جس وقت میں ابا کے پاس آئی اخبار "پیام" اپنے شباب پر تھا۔ ابّا ہفتہ بھر مصروف رہتے تھے حد یہ ہے کہ گھر میں بھی آتے تو ابّا کم اور ایڈیٹر زیادہ معلوم ہوتے جب دیکھئے کچھ لکھ رہے ہیں، اور اگر اتفاق سے ہاتھ میں کاغذ پنسل نہ ہو تو کچھ سوچ رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا کہ دماغ میں کوئی مضمون تیار ہو رہا ہے اس قدر کھوئے ہوئے رہتے کہ ان کو یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں کیا کر رہے ہیں، اور کیا کہہ رہے ہیں۔ مثلاً کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں میں نے نہایت محبت سے کباب کی پلیٹ سامنے کرتے ہوئے چونکانے کے خیال سے کہا "ابّا کباب لیجئے بہت مزے کے ہیں" اور ابّا نے گویا سخت مصروفیت کے باوجود جواب دینے کی زحمت گوارہ کی اور فرمایا "ارے بھئی مجھے فرصت نہیں ہے"۔ اب بتایئے کے کباب کی پلیٹ نہ ہوئی پکنک کے پروگرام کی اسکیم ہوئی کے جس کو عدیم الفرصتی کی بناء پر ٹھکرا دیا گیا اب یہ فرض بھی مجھی کو ادا کرنا پڑتا کہ ان کو یاد دلایا جائے کہ جناب دفتر میں نہیں کھانے کی میز پر ہیں چنانچہ کان کے پاس منہ لے جاکر زور سے کہتی "یہ دسترخوان ہے" فوراً مسکرا دیتے اور بڑے پیار سے کہتے "کیوں شامت آئی ہے" اور کھانے کیطرف متوجہ ہو جاتے۔

ابا ہر چیز بھول جاتے سوائے کتاب اور پنسل کے یہ چیزیں تو جیسے ان کی زندگی کا لازمہ بن گئی تھیں بعض مرتبہ سگریٹ کی جگہ پنسل منہ میں رکھ لیتے اور کئی کئی بار جلانے کی کوشش کرتے جو بھی اس وقت ان کی یہ حرکت دیکھ لیتا ان کو یاد دلاتا کہ "آپ کے منہ میں سگریٹ نہیں پنسل ہے"۔ اپنی اس حرکت پر بے ساختہ ہنس پڑتے اور لاحول پڑھنے لگتے یہی حال عینک کے ساتھ تھا اکثر عینک چہرے

پر ہوتی اور منہ دھو ڈالتے ۔ ابا کی عادت تھی کہ رات کو جب پلنگ پر لیٹ کر پڑھتے تو عینک پیشانی پر کھسکا لیتے (ابا نے پڑھنے کے لئے کبھی عینک استعمال نہیں کی) اور اس وقت کسی کام سے اٹھنا ہوتا یا کوئی صاحب ملنے آجاتے تو فوراً بستر سے اٹھکر عینک کی تلاش شروع کر دیتے ۔ بڑی لجاحت سے پوچھتے "بھئی فاطمہ تم نے کہیں ہماری عینک دیکھی ہے؟" اور میں بھی گویا ان پر احسان کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہتی "جی ہاں آپ کی پیشانی پر رکھی ہے" عینک فوراً آنکھوں پر آجاتی ..... اور کہتے "اچھا دیکھ ابھی آکر کیسی مرمت کرتا ہوں" اور باہر چلے جاتے خیر بات عینک اور پنسل تک رہتی تو بھی مضائقہ نہ تھا مگر معاملہ بھول کا کافی طویل ہو گیا تھا ۔ ایک مرتبہ عالم علی صاحب نے (جن سے میری منگنی ہو چکی تھی) ابا کو فون کیا اور ابا نے انھیں نہ پہچانا ، وہ بیچارے اپنا نام بتاتے رہے اور ابا کو اصرار رہا کہ معاف کیجئے میں آپ کو نہیں پہچان رہا ہوں" جب انھوں نے کہا میں ہاشم علی صاحب کا لڑکا بات کر رہا ہوں ۔ تو ان کو اپنی غائب دماغی پر بہت کوفت ہوئی اکثر لوگوں کے نام تو نام صورت تک بھول جاتے اور اس بھول کی بدولت مغرور کہلاتے ۔ غرض آئے دن اس قسم کے بیسیوں واقعات ہوتے رہتے ۔

ابا کے زمانے میں جمعہ کو حیدرآباد میں عام تعطیل ہوا کرتی تھی جمعرات کی شام سے ابا کے یہاں چھٹی کی تیاریاں شروع ہو جاتیں کہیں نہ کہیں پکنک منانے کا پروگرام بنتا ۔ موسم کے لحاظ سے کھانے پکتے ۔ اگر باہر نہ جاتے تو گھر پر ہی کبھی پچیسی کبھی شطرنج جمتی اور ابا جو ایک ہفتہ تک گھر میں رہتے ہوئے بھی نہ رہنے کے برابر ہوتے تعطیل کے دن وہ واقعی ہم لوگوں کے درمیان ہوا کرتے ۔

ابا نوکروں پر بہت کم غصہ کرتے ہاں اگر ان کے کتوں کی دیکھ بھال میں ذرا سی بھی کوتاہی ہو جاتی تو نوکروں کی شامت آجاتی ۔ کسی نوکر پر غصہ کا یہ انداز بھی خوب ہوتا کہ جس قدر شدت کے ساتھ غصہ آتا اسی قدر ادب سے گفتگو کرتے یعنی

آپ اور جناب سے نوکروں کو مخاطب کرنے لگتے۔ ابا کو بطور لقا غصہ بہت کم آتا تھا۔ دفتر میں یا
گھر پر ہی کوئی بات خلاف مرضی ہو جاتی تو خاموش ہو جاتے اور اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے
کی صفائی شروع کر دیتے۔ تمام کتابوں اور میز کی صفائی ہو جاتی اخبار جن کا ہر طرف
ڈھیر لگا ہوتا قرینے سے ایک جگہ رکھ دیئے جاتے (ورنہ اپنے پڑھنے لکھنے کے سامان کو ہاتھ
لگانے کی کسی کو اجازت نہ تھی) کمرے کی جھاڑ پونچھ گویا یہ اعلان ہوتا کہ ابا کو غصہ آگیا ہے۔
سارے گھر کو چپ لگ جاتی۔ میں جو ابا کے سب سے زیادہ منہ چڑھی تھی نہ جانے کیوں میری
زبان کو تالا سا لگ جاتا اور اس وقت یہ احساس ہوتا کہ ہم لوگ ابا سے کس قدر مرعوب ہیں
خدا جانے کیا بات تھی کہ ہم نہ ڈرتے ہوئے بھی ان کے بگڑے تیور دیکھ کر سہم جاتے
عام طور پر ابا کا غصہ معیادی ہوتا تیسرے دن خود بخود بھلے چنگے ہو جاتے گھر بھر میں زندگی
کی لہر دوڑ جاتی اور ہماری زبانیں پھر قینچی کیطرح چلنے لگتیں۔ غرض یہ بڑا پُر لطف زمانہ ابا کے
ساتھ گذرا ویسے تو یہ اچھا خاصہ طویل زمانہ ہے مگر سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند
لمحے ابا کے ساتھ گذارے ہیں۔

پھر حیدرآباد کے حالات بدلے اور ان بدلے ہوئے حالات نے ابا کو حیدرآباد چھوڑنے
پر مجبور کر دیا، اور ابا لکھنؤ آگئے لکھنے لکھانے کا سلسلہ یہاں بھی جاری تھا لیکن دفتر کا جھگڑا نہ تھا
گھر پر ہی محاورے جمع کرنے کا شوق ہوا کوئی دلچسپ محاورہ نظر سے گذرتا تو ہم لوگوں کو بھی سناتے
اور اظہار خیال کا موقعہ دیتے کبھی کبھی دوپہر کو کوئی پرانا واقعہ یا کتاب سے کوئی کہانی پڑھ
کر سناتے ایک مرتبہ "غبار خاطر" سے "چڑیا چڑے کی کہانی" سنائی ایک تو کہانی بڑی
جاندار اس پر ابا کے سنانے کا دلچسپ انداز آج بھی انکی آواز کانوں میں گونجتی ہے
بس لطف آگیا تھا جی چاہتا کہ ابا کہانی سناتے ہی رہیں۔

کبھی کبھی رات کو کھانے کے بعد بیت بازی کا موڈ آجاتا بچے سب ابا کو گھیر کر بیٹھ جاتے
پارٹی بنتی تو سارا گھر ایک طرف اور ابا تنہا پھر ساتھ ساتھ ابا پر پابندی لگا دی
جاتی کہ جناب فارسی کا شعر نہیں چلے گا لیکن اتنی پابندیوں کے باوجود ہمارے پاس اشعار

کا ذخیرہ ختم ہوجاتا اور جیت ابا ہی کی ہوتی۔ تقسیم ہندوستان کے وقت جو فسادات ہوئے انہوں نے ابا کو بہت متاثر کیا ان کو اپنے بچپن کے ہندو مسلم تعلقات یاد آجاتے تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی پرانا واقعہ اپنے ہندو دوستوں کا لے بیٹھتے ایک مرتبہ سردیوں کا موسم تھا کمرے میں انگیٹھیاں سلگ رہی تھیں سب لوگ گرم کپڑوں میں لپٹے بیٹھے فسادات پر اظہار خیال کررہے تھے ابا نے اپنے دادا کا واقعہ شروع کر دیا کہنے لگے "دو بھی یہ سب گوری چمڑی کی لگائی آگ ہے ورنہ ہم نے ہندو مسلم اتحاد کا وہ رنگ دیکھا ہے کہ کسی مسلمان مسلمان میں بھی ایسا اتحاد نہ ہوگا۔ جب دہلی میں غدر ہوا تو اس وقت ہمارے دادا (قاضی حامد علی)، مراد آباد کے قاضی تھے اور ہمارے والد کی عمر اس وقت تیرا سال تھی۔ دہلی کے قلعہ میں کہرام برپا تھا اس قیامت میں ایک شہزادہ قلعہ سے بھاگ کر مراد آبا کی طرف آنکلا، نفسا نفسی کا عالم تھا کوئی شہزادے کو پناہ دینے کو تیار نہ تھا۔ ہمارے دادا کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے شہزادے کو اپنے یہاں چھپا لیا۔ انگریزوں کے پٹھو ہر طرف پھیلے ہوئے تھے کسی نے خبر دی کہ مراد آباد کے قاضی نے شہزادے کو پناہ دیکر غداری کی ہے شہر میں کھلبلی مچ گئی ہمارے دادا کے دوست احباب گھبرائے ہوئے آئے اور کہا قاضی جی آپ نے یہ کیا غضب کیا آپ آپکی خیر نہیں خدا کیلئے روپوش ہو جایئے۔ آپ پر غداری کا الزام لگ چکا ہے، مگر قاضی جی نے صاف انکار کر دیا اور کہا میں نے غداری نہیں وفاداری کی ہے۔ اب جو کچھ ہوگا دیکھا جائیگا۔

چنانچہ ہمارے دادا مسجد میں عصر کی نماز ادا کر رہے تھے کہ انگریز ان کو پکڑ لے گئے اور آناً فاناً پھانسی دیدی۔ ادھر پھانسی ہوئی ادھر دادی کو مع بچوں کے گھر سے نکال کر مکان اور جائیداد ضبط کر لی۔ انگریزوں کے ظلم و ستم سے ہر شخص خائف تھا۔ قاضی جی کی بیوی کو پناہ دینے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ مگر کسی اللہ کے بندے نے رات گذارنے کیلئے جگہ دے دی۔ آدھی رات کا وقت ہوگا کہ کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی سارے گھر کی جیسے جان نکل گئی لیکن مسلسل کنڈی کی آواز پر پرتا

کیا نہ کرتا دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ ایک "لالہ" آئے ہیں۔ اور قاضی جی کی بیوی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری دادی نے دروازے کی اوٹ سے آنے کی وجہ پوچھی تو لالہ نے کہا "بہن قاضی جی کی لاش بے گور وکفن پڑی ہے اس کے لئے بھی کچھ سوچا" ہماری دادی نے کہا "بھلا لالہ آدھی رات وہ بھی قیامت کی یہ مجبور عورت ذات کیا کر سکتی ہوں؟" لالہ نے ہمت دلائی اور کہا چلو "ان کی لاش تلاش کر کے کچھ انتیظام کریں" ابا نے ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ لمبی سانس لی اور کہنے لگے "اس زمانے کی عورتیں جنھوں نے زندگی میں کبھی قدم گھر سے باہر نہ نکالا ہو وقت پڑنے پر مرد سے زیادہ، ہمت کر جاتی تھیں غرض ہماری دادی لالہ کے ساتھ جہاں سولی لٹکائی گئی تھی وہاں پہنچیں اور ہزاروں لاشوں میں سے شوہر کی لاش تلاش کی، وہیں پر ایک گڑھا کھودا اور لاش دفن کر کے نشانی کے طور ایک لکڑی لگا دی اور گھر آگئیں۔ اس کے بعد جب حالات درست ہوئے اور ہمارے دادا بے قصور ثابت ہوئے جان تو واپس نہ آسکی لیکن انگریزوں نے بڑی عنایت کی کہ مکان اور جائیداد واپس کر دی بلکہ کچھ انعام بھی دیا۔ پھر اس وقت ہمارے دادا کی قبر بھی بنوائی گئی۔ کیونکہ دفن کرتے وقت کسی کو یہ ہوش نہ تھا کہ سر کس طرف ہے اور پاؤں کدھر چنانچہ اس لکڑی کی مدد سے قبر پہچانی گئی اور چوکور قبر بنادی گئی اور وہی حشر کا میدان ہمارا خاندانی قبرستان بن گیا جب ابا قصہ ختم کر چکے تو میں نے پوچھا کہ آخر وہ لالہ کون تھے جن کو قاضی جی سے اتنا لگاؤ تھا کہ اتنی ہمت کر گئے تو ابا نے کہا کہ "اس زمانے میں لوگ بڑے وضع دار اور مخلص ہوتے تھے محلہ تمباکو والا میں ہمارے گھر کے قریب ان لالہ کی ایک چھوٹی سی دکان تھی ہمارے دادا شام کو اس دکان پر جا کر بیٹھا کرتے تھے آج کل نہ ویسے دکان دار ہیں نہ ویسی دکانیں اس زمانے کی دکانوں پر بیٹھکیں جما کرتی تھیں ادبی محفلیں ہوتی تھیں حالات حاضرہ پر تبصرے ہوا کرتے تھے ان لالہ کے گھر والوں کا بھی ہمارے یہاں آنا جانا تھا بس یہی تعلقات تھے جن کی بناء پر لالہ نے ہماری دادی

کا ساتھ دیا۔ ہمارا بچپن تھا لالہ کا انتقال ہو چکا تھا ہمیں یاد ہے کہ جب تک ڈیڈی یعنی ان
کی بیوی دلہن کا منہ نہ دیکھ لیتیں گھر کی لڑکیاں بے چین رہتیں مگر منہ دیکھنے کی اجا
نہ ملتی۔ ڈیڈی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر آتیں اپنے ہاتھ سے دلہن کا گھونگھٹ
اٹھاتیں دعا دیتیں اور اپنی میلی ساری کے کونے سے ایک اٹھنی کھول کر دلہن
ہاتھ پر رکھ دیتیں۔ اسکے بعد منہ دکھائی شروع ہوتی۔ تو بھئی یہ تھے ہندو مسلم تعلقات
دونوں اپنے اپنے مذہب کے سختی سے پابند تھے اسکے باوجود بھائی چارہ قائم تھا
ابا نے قصہ ختم کر دیا اور ہم سوچنے لگے کہ واقعی جن لوگوں نے اتحاد کے یہ مناظر دیکھے ہوں
وہ اب کیوں کر جی سکتے ہیں۔

قصے کہانیوں کے علاوہ ابا کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ استادی گانوں کا شوق وہ
ریڈیو سے پورا کرتے اور گھر میں اکثر شام کو ڈھولک جمتی وہ گیت جس میں بیٹی سسرال
میں رہ کر اپنے کنوارے پن کو یاد کرتی ہے بہت بھاتے اور بابل سن کر تو ان کی عجیب
کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔

ابا قہقہہ مار کر بہت کم ہنستے اور اگر کسی وقت بے قابو ہو کر ہنس دیتے تو جلد
ہی اس پر قابو پا لیتے ایسا معلوم ہوتا جیسے زور سے ہنس کر انھوں نے کوئی بڑی غلطی
کی ہو۔ ابا کو عمدہ کھانے اور بہترین کپڑوں کا بیحد شوق تھا۔ کپڑا ہمیشہ بہت اچھے
پہنتے بڑے جامہ زیب بھی تھے۔ چوڑیدار پاجامہ پر جیب ہمرنگ ٹوپی اور شیروانی
پہن کر باہر نکلتے تو میں اکثر جھوٹ موٹ کچھ پڑھ کر پھونکتی اور کہتی کہ خدا نہ کرے کو
بلا ساتھ نہ لگ جائے تو ہمیشہ کہتے "دیکھ کیسے دیتا ہوں منہ کو لگام دینا سیکھ ورنہ
سسرال میں جوتے کھائے گی" جھومتی ہوئی چال پر تو نجانے ابا نے کتنوں کو قر
کیا ہوگا وہ بھلا ہم کو کیوں بتلانے لگے!!

ابا کی کتاب زندگی میں کفایت شعاری کا کوئی باب نہ تھا، اور میں یقین سے
کہہ سکتی ہوں کہ جو کچھ کماتے کھانے اور کھلانے پر اڑا دیتے۔ ابا نے حساب کتا

کا جھگڑا کبھی مول نہ لیا اور ہمیشہ سولہ سو کے ہزار کرتے رہے ان کو کبھی اخبار "پیام" کی صحیح آمدنی کا علم ہوا نہ گھر کے اخراجات کے حساب لکھنے کا ان کو خیال آیا۔ وہ کہتے خرچ ہو جانے کے بعد حساب لکھنے سے کیا حاصل؟

ابّا دعوتیں بھی بہت کرتے تھے جب دعوت کا دن آتا تو سارا دن پریشانی میں گزرتا دو باتوں کی فکر رہتی ایک تو کھانا عمدہ پکے دوسرے کم نہ پڑے ان چیزوں کے متعلق دن بھر میں اتنے سوالات کرتے کہ ہم لوگوں کے ہاتھ پیر پھلا دیتے طبیعت میں جلدی بھی غضب کی تھی اور اپنی جلدبازی میں اچھا خاصا کام اوندھا کر دیتے یہی عالم ضد کا تھا جب کسی بات پر ضد آجاتی تو خود ہی نقصان اٹھاتے لیکن ضد پوری کر کے رہتے۔ معمولی معمولی چیزوں کو جن کی طرف ہمارا دھیان بھی نہ جاتا ابّا اس کی گہرائی تک پہنچ جاتے۔ ایک دفعہ کا بڑا دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ آپ بھی سنئے ایک دن ہم نے دیکھا کہ ابّا صحن میں کبوتروں سے گفتگو میں مصروف ہیں جب ہم نے دیکھا کہ ایک کبوتری ابّا کی گود میں بیٹھی ہے اور کبوتر بڑی بے قراری سے اِدھر اُدھر پھر رہا ہے سینہ تان کر آتا ہے اور ابّا کے پیروں میں چونچ مارتا ہے۔ کبھی دم اٹھا کر سر سے لگا لیتا ہے کبھی چونچ زمین پر مارتا ہے، کبھی پاؤں پٹختا ہے ہم لوگوں نے پوچھا آخر یہ معاملہ کیا ہے کہنے لگے "میں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں یہ بدمعاش خود تو کھلتے ہی کابک سے باہر آکر دانہ کھانے لگتا ہے اور یہ غریب کبوتری باہر نکلی کہ اس کے اطراف ناچ ناچ کر اور چونچ مار مار کر اسے کابک میں بٹھا دیتا ہے۔ بیچاری کو پیٹ بھر کھانے بھی نہیں دیتا"۔ پھر کبوتر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "جب تک اچھی طرح زمین پر ناک نہ رگڑو گے کبوتری نہیں چھوڑونگا، ضرور کوئی مولوی خاندان کا معلوم ہوتا ہے"۔ ہم لوگوں نے کبھی محسوس بھی نہ کیا تھا کہ اتنے کبوتروں میں ایک مولوی بھی ہے مگر ابّا تاڑ گئے اور اس کو سزا دیکر اپنی تشفی بھی کر لی۔ جو مولوی صرف عورت کے تعلق سے واعظ کرتے اور صرف عورت کے فرائض گنتے ایسے مولویوں سے ابّا کو نفرت تھی

کہتے ان لوگوں نے عورت کو اس کے جائز مقام سے محروم کر دیا ہے۔

ابّا کو طلبا سے بڑی دلچسپی تھی اگر انکے سامنے کالج کے کسی لڑکے کی بدتمیزی کی شکایت کی جاتی تو بڑی ہمدردی کے ساتھ کہتے بھئی ارے بھئی ان بیچاروں کو کچھ نہ کہا کرو یہی چند سال تو ان کی زندگی میں بے فکری کے ہوتے ہیں کالج سے نکلنے کے بعد یہ غریب دنیا بھر کے جھمیلوں میں گرفتار ہو جائیں گے ان کو تو معاف کر دینا چاہئیے۔"

حیدر آباد سے آنے کے بعد ابّا کی صحت گرنے لگی اور علی گڑھ آکر تو باقاعدہ بیمار ہو گئے۔ بیماری کی تشخیص میں کئی سال گذر گئے بمبئی میں پتّے کا آپریشن ہوا تو معلوم ہوا کہ جگر میں کینسر ہے جس ہمّت سے ابّا نے بیماری کا مقابلہ کیا بہت کم ایسے لوگ دیکھنے میں آئے۔ آپریشن کے بعد جب حیدر آباد آئے اور یہاں سے دہلی جا رہے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپریشن کروا کے نہیں تفریح کر کے آئے ہیں۔ آپریشن کے وقت ڈاکٹر مقبول علی صاحب موجود تھے وہ ابّا کی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔

حیدر آباد کے اسٹیشن پر دوست احباب جمع تھے گاڑی روانہ ہونے کو تھی مقبول علی صاحب اصرار کر رہے تھے کہ ابّا سوار ہو جائیں اتنے میں گاڑی نے حرکت کی ابّا یہ کہتے ہوئے کہ "اجی ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے بڈھا سمجھا ہے کیا؟" چلتی ٹرین میں اُچک کر سوار ہو گئے اور سب لوگ حیران تھے کہ کیا واقعی ان کو کینسر ہے؟ ابّا چند مہینے ٹھیک رہے یوں تو پوری بیماری کے دوران کبھی کام سے پیچھے نہ ہٹے لکھنے پڑھنے کا تو یہ حال تھا کہ ریل ہو یا ہوائی جہاز میں ہوں یا بستر پر قلم چلتا ہی رہتا ہاتھ کے ہلنے یا بے ڈھب ہوتے سے ابّا کے لکھنے پر کوئی اثر نہ پڑتا اور یہ ایک عجیب بات تھی! وہ ہر جگہ اطمینان سے لکھ سکتے تھے بلکہ ٹرین میں اکثر ٹائپ بھی کرتے۔

غرض بیماری نے زور پکڑا، کینسر نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا درد کی

تکلیف رہنے لگی اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ہاتھ میں قلم ہوتا دوسرے ہاتھ سے گرم پانی کی بوتل پیٹ سے لگائے ہوتے۔ چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا پھر بھی لکھتے جاتے اور لکھتے جاتے سنا ہے کہ بارہ بجے تک جس دن انتقال ہوا ہے کام کرتے رہے خود نہ لکھ سکے مگر لکھواتے رہے اور جب دفتر سے مضامین ٹائپ کراکے چپراسی گھر آیا تو ابا ہمیشہ کیلئے خاموش ہو چکے تھے بس یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے جیسے مرض میں شدت ہوتی تو کام میں بھی شدت پیدا کر دیتے ہم لوگ روکتے تو کہتے کہ کام کرتا ہوں اس لئے مرض کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ اگر میرے ہاتھ میں قلم نہ ہوتا تو کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔

ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ آپریشن پھر ہونا چاہئے لیکن مسلسل بیماری نے مالی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا مولانا آزاد مرحوم نے آپریشن کرانے میں پس و پیش کی وجہ کو تاڑ لیا اور اخراجات کی پوری ذمہ داری لی اور ابا دہلی کے نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے میرے پاس تار آیا کہ فوراً آؤ تمہارے ابا کے آپریشن کی تاریخ مقرر ہو گئی خیر میں بھی پہنچ گئی اور آپا بھی آ گئیں لیکن ان کی حالت غیر تھی معلوم ہوتا تھا کہ آپا کا ہی آپریشن ہونے والا ہے ابا نے آپا کی پریشانی کا اندازہ صورت دیکھ کر ہی لگایا اور تسلی دینے لگے جیسے واقعی آپا کا آپریشن ہو رہا ہو کہنے لگے "دلہن بالکل معمولی آپریشن ہے ڈاکٹر کہتے ہیں خطرے کی کوئی بات نہیں ہے صرف آدھے گھنٹے کا آپریشن ہوگا"۔ ابا اپنی بیماری میں جتنے مضبوط تھے اپنے بچوں کے معاملہ میں اتنے ہی بودے اور کمزور۔ بچوں کو انجکشن بھی لگتا تو گھر سے باہر چلے جاتے لیکن اپنے آپریشن کے روز بے حد مطمئن تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس عمر میں اور اتنے بڑے آپریشن کیلئے اتنا باہمت مریض ہم نے نہیں دیکھا پریشانی سے اکثر نبض اور دل کی حرکت دونوں متاثر ہوتی ہیں لیکن قاضی صاحب کا دل اور نبض دونوں نارمل ہیں جس وقت پہیوں کا پلنگ ان کو لینے آیا تو خود ہی ہنستے ہوئے اٹھے کہنے لگے "لیجئے جناب ہماری سواری آ گئی ہم چلتے ہیں اور پلنگ

بھر لیٹ گئے۔ اس آپریشن کے بعد ابّا کو کئی دن ہوش نہ آیا ہم لوگ تو مایوس ہو چکے
تھے لیکن ابھی زندگی باقی تھی بہتر ہونا شروع ہوئے بات چیت کرنے لگے کچھ اپنے
اطراف کے ماحول سے دلچسپی لینا شروع کی۔ ایک دن قریب سے کسی مریض کے
کراہنے کی آواز آئی تو کہنے لگے "تم لوگ اس مریض کی آواز سے اس کا حلیہ
بتا سکتے ہو"۔ میں نے کہا ہم لوگ تو اس کو دیکھ چکے ہیں۔ آپ بتائیے۔ تو یقین
مانیئے اس مریض کا رنگ، اس کی جسامت، اس کا قد، اس کی عمر سب ہی کچھ ابّا
نے بتا ڈالا۔ ہم لوگ تو حیران رہ گئے تھے لیکن عجیب بات تو یہ تھی کہ آواز سے
حلیہ پہچاننے والے ابّا کبھی دوست اور دشمن میں تمیز نہ کر سکے ہر شخص کو سچا اور
قابل بھروسہ سمجھ لیتے اور جب مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا تو بڑی حسرت سے کہتے
"آخر انسان ایسا کیوں ہوتا ہے"۔ ابّا چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے کار کی
بھی وہی رفتار تھی لیکن آپریشن کامیاب نہ ہوا کینسر نے سارے جسم پر قبضہ جما لیا
تھا اور صاف ظاہر تھا کہ شمع گل ہونے کو ہے ابّا نے تو اس بات کو بہت پہلے محسوس
کر لیا تھا چنانچہ جب وہ آخری بار حیدرآباد آئے ہوئے تھے تو ایک دن میں باوجود
کوشش کے سارا دن ان کے کمرے میں نہ جا سکی ان سے ملنے والوں کا تانتا
بندھا تھا۔ شام کو گئی تو مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے "آج صبح سے کہاں غائب تھی؟
دیکھو جو وقت ابّا کے ساتھ گذارتی ہے اسے غنیمت سمجھ ورنہ جب ابّا نہ ہونگے تو
پچھتاؤ گی کہ تھوڑی دیر ابّا کے پاس بیٹھی بھی نہیں"۔ اور ابّا کی یہ پیشین گوئی حرف
بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ ڈسمبر میں حیدرآباد آتے وقت جب ان سے رخصت ہوئی
تو کہنے لگے جاؤ بیٹی اب تو تم ہماری خبر ہی سنو گی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی دن
ہم بھی ہوش صاحب کی طرح چل دینگے (ہوش بلگرامی کے انتقال کا ان کو بہت
صدمہ تھا) ابّا کی آنکھوں میں پہلی بار مایوسی کے آنسو تھے۔ میں نے اپنے آنسوؤں
پر قابو پالیا لیکن آواز نہ نکل سکی۔ چند منٹ ان کو دیکھتی رہی پھر خود ہی بولے

"اچھا اب خدا حافظ ٹرین کا وقت بھی قریب آرہا ہے اپنا فون نمبر دے دو۔ شاید کوئی وقت آپڑے" میں دگیر حیدرآباد آگئی۔ آئے ہوئے مشکل سے ایک مہینہ ہوا تھا کہ ۱۷ جنوری ۱۹۵۰ء کی شام کو مجھے تار ملا کہ ابا رخصت ہوگئے دوسرے ہی دن میں گلبرگہ کیلئے روانہ ہوگئی وہاں جنبی گھر ابا کی ہر چیز اپنی جگہ پر تھی بس ابا نہ تھے کسی گوشے سے بھی ان کی آواز نہ آئی بار بار پکارنے پر بھی جواب نہ ملا۔ ورنہ ان کی تو جیسے عادت سی پڑ گئی تھی کہ جب میں حیدرآباد سے جاتی تو سلام نہ دعا دیکھتے ہی کہتے "آپ کیوں تشریف لاتی ہیں کس نے بلایا ہے آپ کو؟ اپنے باپ کا گھر سمجھ لیا ہے کہ منہ اُٹھائے چلی آتی ہیں" اور میں بھی بناوٹی غصے سے قریب رکھا آئینہ سامنے کر کے کہتی "دیکھا ہے میرے باپ کو؟ ہر بات میں میرے باپ کا نام نہ لیا کیجیے"۔ لیکن اس دن میں نے سوچا کہ واقعی میں یہاں کیوں آگئی۔ یہ تو میرے باپ کا گھر نہیں ہے۔ بغیر باپ کے گھر کیسے ہو سکتا ہے!

لیجئے یہ چند لمحے بیت گئے اور بقول ابا کے:-

وہ دورِ بہاراں بیت گیا روداد جوانی ختم ہوئی
اشکوں کو زمانہ کیا دے گا اپنی تو کہانی ختم ہوئی

★ "جو ضرورت خواہشوں سے پیدا ہوتی ہے وہ ضرورت نہیں ہے حرص ہے!"

★ "ضمیر ایک دوست کی طرح متنبہ کرتا ہے"!

★ "اور ایک عدالت کی طرح سزا دیتا ہے"!

★ "انسان کا ضمیر خدا کی آواز ہے"!

(قاضی محمد عبد الغفار)

مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ میرے دن کا آرام اور رات کی نیندیں حرام کر دیں اور مقررہ پروگرام سے دو مہینے پہلے ہی واپس آ گئے اور اس طرح ہنماٹ کے اسٹیشن پر پیارے ابا والد نے مجھے انکے حوالے کر دیا مجھے نکری مرآباد آباد پہونچے۔ دیکھئے باوجود کوشش کے بھی میں اس کہانی سے اپنی کہانی الگ نہ کر سکی۔

ماموں میاں بے حد اصولی انسان تھے۔ لیکن انکا اصول کسی کے لئے وبال جان نہ تھا اصول اور وقت کی پابندی کی وجہ سے انکے گھر کے اندر اور باہر کے تمام کاروبار مشین کی طرح انجام پاتے نفاست پسند اتنے کہ انکو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا کہ بس دھلے دھلائے رکھے ہیں تھے بڑے حسین یالم از کم مجھے تو ان سے زیادہ کوئی حسین نظر نہیں آیا علاوہ آنکھیں اونچی ناک چھوٹا سا دہانہ خاموش بھی بیٹھتے تو معلوم ہوتا مسکرا رہے ہیں، بھرا بھرا جسم سُرخ سفید رنگ، گرمیوں میں چکن کا انگرکھا پہنتے۔ سوٹ پہنتے تو انگریز اور ہندوستانی کی تمیز مشکل ہو جاتی۔ بات چیت کا انداز نرم و شیریں، غصہ بھی کرتے تو میٹھا میٹھا، کھانے پینے اور نشست برخاست میں آداب کو ملحوظ رکھتے۔ بزرگوں کے سامنے شیروانی اور ٹوپی بغیر نہ جاتے انکے سامنے پاؤں پر پاؤں رکھ کر نہ بیٹھتے۔

کھانا بڑی نفاست اور اسلامی اصول سے کھاتے شروع کرتے بسم اللہ سے اور ختم کرتے دعا پڑھکر، چپاتی کا پہلا نوالہ ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے توڑتے۔ سالن نکالنے میں اگر میرے ہاتھ سے دسترخوان پر ٹپکا جاتا تو بڑی خوبصورتی سے دھبہ دکھا کر کہتے دیکھئے جناب یہ آپ نے کیا کر دیا ہے میں شرمندہ ہو جاتی اور آئندہ احتیاط برتتی۔

گھر میں بیوی بچے نہ ہونے کی وجہ سے سارا کاروبار نوکروں کے ہاتھ میں تھا لیکن ہر کام اتنا وقت اور قاعدے سے ہوتا کہ گیا کوئی گھر والی کرتی۔ نوکروں کے ساتھ انکا برتاؤ غیر معمولی نرم تھا ملازم پرانے تھے کچھ انکے ساتھ کھیلے ہوئے کچھ انکے سامنے کے بچے، ماموں میاں جہاں جاتے یہ ملازم مع خاندان انکے ساتھ ہوتے نوکر کو حکم دیتے تو لہجہ میں لجاجت آجاتی تھی

کا وقت آتا تو کہتے ہو کیوں بھئی محمد علی ہم کو کھانا دو گے؟ گویا انکا آب و دانہ محمد علی کے ہاتھ میں

ہو محمد علی بچپن کے ساتھی تھے لہٰذا ان کا دماغ بھی ذرا اونچا تھا مالک کی ذرا سی بات پر ناراض

ہو جاتے اور ماموں میاں کو انھیں منانے کے لئے بہانہ تلاش کرنا پڑتا۔ اگر کبھی کہہ دیتے کہ بھئی محمد علی

آج ہماری شیروانی پر استری نہیں ہوئی بس محمد علی خفا ہو جاتے۔ ماموں میاں کا کام کرنا چھوڑ دیتے

سامنا بھی نہ کرتے اور چھوٹے لڑکے ابن کو اپنی جگہ لگا دیتے وہ میرے ساتھ کا کھیلا ہوا تھا۔

صبح پانچ بجے سے ڈیوٹی کرنا پڑتی تھی مجھ سے کہتا فاطمہ بی بی ہمارے ابا تو ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے

دیتے بھلا بتایئے سرکار کی ذرا سی بات پہ بگڑ جاتے ہیں میرے خیال میں تو کام سے بچنے کا بہانا

ہوتا ہے اور ہماری شامت آجاتی ہے۔ یہ لڑائی دو دن سے زیادہ نہ رہتی سرکار ہی محمد علی کو بلاتے

اور کسی دعوت کے متعلق اس طرح مشورہ لیتے گویا محمد علی کی رائے کی جو اہمیت ہے وہ کسی کو نہیں

ہے اور اس طرح پھر دوستی ہو جاتی۔

اپنا کوئی کام ماموں میاں ہاتھ سے نہ کرتے تھے حجام اگر خط بناتا تو کنگھی کرتا عطر لگا جوتا

پہناتا اس معاملہ میں وہ بالکل بچوں جیسے تھے اپنے ہاتھ سے اگر کبھی کنگھی کرتے تو رنگ کی جگہ کبھی

کبھی مانگیں نکل جاتیں عطر ضرور لگاتے خود لگا لیتے تو معلوم ہوتا کپڑوں پہ سالن ٹپکا لیا ہے۔ گھر

والے اگر کہہ دیتے کہ آج معلوم ہوتا ہے آپ نے اپنے ہاتھ سے عطر لگایا تو معصوم سی ہنسی ہنس دیتے۔

ملازمین کے شادی و غم میں برابر کے شریک رہتے، نوکر کی شادی میں شرکت کرنا ہے تو بڑی

سے بڑی دعوت سے بھی یہ کہکر معذرت کر لیتے کہ آج میرے ملازم کی شادی ہے۔ مجھے ملازمین

کا نام لینے کی اجازت نہ تھی۔ سب ملازم مرد تھے لیکن میں کسی کو کالی اماں کسی کو گوری اماں اور

کسی کو جانی اماں کہتی تھی۔ اگر کوئی نوکر مجھے آواز دیتا اور میں جواب میں ہوں کہہ دیتی تو فوراً ٹوک دیتے

جناب "یہ ہوں کیا چیز ہوتی ہے؟" میں ان سب سے آپ جناب سے ہی بات کرتی تھی۔

محمد علی کے علاوہ جان محمد اور سلامت انکو بہت عزیز تھے۔ سلامت کو ڈاکٹر نے

دق کا شبہ بتایا تو اپنے ساتھ ولایت لے گئے تاکہ بہتر علاج ہو سکے۔ جان محمد کا انتقال

ہوا تو دلی سے کار کے ذریعہ میت میں شریک ہونے آئے اسکی بیوہ (جو کئی چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں تھی) کی شادی اپنے ایک ملازم نعمت سے کردی لیکن بچوں کے اخراجات کے لئے ماہانہ مقرر کردیا اور جب لڑکیاں شادی کے قابل ہوئیں تو آپا کو خاص طور پر انکی شادی کے انتظامات کے لئے بلایا اور بڑے ٹھاٹ کی شادی کی جہیز ایسا جوڑا کہ کیا کوئی عورت کرتی۔ کوئی ایسی ضرورت کی چیز نہ تھی جو جہیز اور بری میں شامل نہ ہو۔ جان محمد کے بچوں کے ساتھ یہ سلوک اس خدمت کا صلہ تھا جو انھوں نے ماموں میاں کی سخت بیماری میں کی تھی۔

ماموں میاں بہت ہلکی غذا کھاتے تھے انکا کھانا بدھن پکاتے تھے انتقال سے چند مہینے پہلے غذا بالکل چھوٹ گئی تھی صرف چھاچھ پر گذارا کرتے تھے بدھن نے کہا کہ آپکی غذا تو کچھ رہی نہیں میں بھی بڈھا ہو گیا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو مراد آباد چلا جاؤں کہنے لگے "بھی بدھن ساری زندگی ہمارے ساتھ گذاری اب ہماری چار دن کی زندگی میں کیوں ساتھ چھوڑتے ہو۔ بدھن نے ارادہ ملتوی کردیا۔ وقت کی بات ہوتی ہے کہ اس گفتگو کے چار دن بعد ماموں میاں چل بسے بدھن یہی کہکر دھاڑیں مار رہے تھے کہ سرکار اتنے زبان کے سچے ہونگے میں نے سوچا بھی نہ تھا۔

جس کا سلوک ملازمین کے ساتھ ایسا ہو سوچئے خاندان اور احباب کے ساتھ کیا رہا ہوگا۔ خاندان کے ہر چھوٹے بڑے سے انکے تعلقات یکساں تھے امیر غریب کی اصطلاحوں میں تو شاید وہ سوچنا جانتے ہی نہ تھے۔ خاندان میں کسی پر برا وقت پڑتا تو نہ بچوں کو یتیمی کا احساس ہونے دیتے نہ بیوہ کو گذر بسر کے لئے چادر سر پر ڈال کر باہر نکلنا پڑتا ان تمام باتوں کے لئے ماموں میاں اپنی ذمہ داری سمجھتے خاندان میں انکو سرپرست کا مقام حاصل تھا۔

مدد کرتے تو اس طرح جیسے انکا فرض ہے اور لینا والا اس طرح لیتا گویا ماموں میاں پر بڑا احسان کر رہا ہے۔ ان کے ایک چچا تھے اللہ معاف کرے انکی جائداد میں سے مُردوں کے مال سے اضافہ ہوتا تھا۔ کہنے کو عالم فاضل تھے حلیہ ایسا کہ اچھے اچھے عابد و زاہد انکے سامنے پانی بھریں۔

اپنے کو مذہب کا ٹھیکہ دار سمجھتے تھے۔ حدیث بغل میں دبی رہتی خاندان کا کوئی لاولد مرتا تو نہ جانے کس شرع کی رو سے انکا حصّہ ضرور نکل آتا۔ یہ سگے چچا بھی نہ تھے ہمارے نانا کے چچا زاد بھائی تھے۔ ماموں میاں ان کا بے حد احترام کرتے تھے جب ماموں میاں کے قلب پر حملہ ہوا تو ڈاکٹر کئی دن انکی زندگی سے مایوس رہے چچا ابّا کی مراد بر آئی یہ بھوپال کے قاضی تھے۔ فوراً کاغذات لیکر پہونچے اور کہنے لگے معٔ یعقوب تمہاری زندگی کا بھروسہ نہیں بہتر ہوگا کہ تم جائداد ننھے میاں (انکے بیٹے) کے نام کر دو ماموں میاں نے کمزور آواز میں جواب دیا "چچا ابّا ابھی تو میں زندہ ہوں" اور ابّا خاموش ہوگئے ابّا یعنی میرے خالو اور بھائی وہاں موجود تھے اس گفتگو سے برہم ہوگئے اور ڈاکٹروں سے کہہ کر وارڈ کے باہر کر دیا۔ اسکے باوجود ماموں میاں جب تک زندہ رہے انکی عزت اور احترام میں فرق نہ آنے دیا۔ اور جب ماموں میاں کا انتقال ہوا تو چچا ابّا نے میرے والد کو پتہ سے کا تار اس طرح دیا۔

"بہت افسوس ہوا یعقوب کا انتقال ہوگیا امید ہے انکا سامان میرے لئے محفوظ کرلیا ہوگا" دنیا ایسے سنگدلوں سے خالی نہیں ہے

ماموں میاں جہاں جاتے عزیزوں دوستوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے حیدر آباد آئے تو یہاں بھی کچھ دوست اور دوستوں کے رشتے دار مل گئے۔ انکو پتہ چلا کہ کسی صاحب کی بیوہ بھی یہاں رہتی ہیں جو مراد آباد میں انکے محلدار تھے کسی طرح پتہ چلا کر ان کے یہاں پہونچے گلیوں میں مکان تھا موٹر نہ جاسکتی تھی تو پیدل جاکر ان سے ملتے جس کا اُن بڑی بی کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ موٹر بھیج کر اپنے یہاں بلاتے بھی تھے، جب ہم سے ملتیں تو کہتیں اتنا بڑا آدمی مجھ غریب کے گھر آتا ہے محلے والے مجھے عزت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔

دوست احباب کی کوئی گنتی نہ تھی نہ جانے کون واقعی دوست تھا اور کون ملاقاتی۔ میں نے سجاد حیدر یلدرم، سر رضا علی خواجہ حسن نظامی کو قریب سے دیکھا ہے عجیب اتفاق ہے کہ ماموں میاں ان تینوں کے سامنے گئے۔

علیگڑھ یونیورسٹی کا ہر طالب علم انکا دوست تھا چھوٹا ہو یا بڑا۔ یہاں آئے تو پنجتن چچا اور آغا چچا کے ساتھ انکا وہی سلوک تھا جو ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے ہونا چاہئے۔
آغا حیدر حسن چونکہ آپا حیدر کے نام سے مضامین لکھتے تھے تو ماموں میاں نے بھی ہمیشہ آپا حیدر ہی سے مخاطب کیا دور سے دیکھتے ہی کہتے آؤ جی آپا حیدر۔
دوست احباب کے معاملے میں کبھی سیاسی اختلافات کو ذاتی تعلقات کے درمیان نہ آنے دیا۔ ایک مرتبہ جب خلافت تحریک زوروں پر تھی مولانا شوکت علی مرادآباد آئے اور ایک مسجد میں مجمع کو خطاب کیا جوش میں آکر ماموں میاں پر بھی اعتراضات شروع کر دیئے چند منٹ تو مجمع خاموش رہا پھر مولانا پر جوتوں اور پتھروں کی بارش کردی اور مرادآباد چھوڑ دو کے نعرے لگنے لگے۔ مرادآباد والے ماموں میاں پر جان چھڑکتے تھے وہ بھلا کاہے کو گالیاں برداشت کرتے!!
بات ماموں میاں تک پہونچنا ضرور تھا۔ رات کو انھیں کھانے پر مدعو کیا اور انکے ساتھ مسجد میں جو سلوک ہوا اسکی معافی چاہی مولانا نے ماموں میاں کو گلے لگا لیا کہنے لگے "یعقوب میں نے تمکو پہچانا نہیں مجھکو معاف کر دو" ماموں میاں نے کہا "ہمارے سیاسی میدان الگ ہیں جو کچھ تم نے کہا وقت کا تقاضا تھا۔ اس کا اثر ہمارے ذاتی تعلقات پر نہیں پڑنا چاہیئے"۔
اب کہاں ہیں ایسے لوگ ماموں میاں اور مولانا شوکت علی کی عظمت کا قایل ہونا پڑتا ہے۔
آجکل کون گالیاں دیکر شرمندہ ہوتا ہے۔ اور کون گالیاں سنکر بھی بے مزہ نہیں ہوتا۔
کبھی صحیح تعداد کا پتہ نہ چلا کہ کتنوں کو تعلیم دلوائی کتنوں کو نوکریاں۔ ویسے ہفتہ میں دو دن فقراء میں خیرات تقسیم ہوتی، سردیوں میں رضائیاں تقسیم کی جاتیں۔ مذہبی انسان تھے سگریٹ حقہ اور شراب کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ انگریزوں کی دعوتوں میں میز شرابوں سے بھری رہتی پینے کا دور شروع ہوتا تو گھر کے زنانے حصے میں آکر مہمانوں کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ روزہ پابندی سے رکھتے تھے انتقال سے چند ماہ پہلے صحت بہت بگڑ گئی تھی اس سال روزہ نہ رکھ سکے لیکن، احترام اتنا تھا کہ روزدار نوکر کو کھانے کی میز پر نہ آنے دیتے کوئی روزے کے متعلق پوچھتا تو

الحمد اللہ کہہ دیتے۔ دعوتیں کرنے اور دعوتوں میں شریک ہونے کا بہت شوق تھا آخری زمانے میں جب غذا بالکل چھوٹ گئی تھی دعوتوں میں اپنے چھاچھ کے گلاس کے ساتھ شرکت ضرور کرتے۔ مہمانوں کا آنا باعث رحمت سمجھتے تھے گھر کبھی مہمانوں سے خالی نہ دیکھا انکے نوکروں نے تو گھر کا نام ہی یعقوب ہوٹل رکھ دیا تھا۔

سفارشیں کرنے میں پیش پیش رہتے سفارشی خطوں میں ہر ایک کو اپنا دوست یا عزیز لکھ دیتے چاہے وہ دھوبی ہی کیوں نہ ہو۔

میرے خالہ زاد بھائی سے انکو بڑی امید تھیں وہ سمجھتے تھے کہ انکے دم سے ماموں کا گھر ہمیشہ آباد رہیگا، مگر افسوس دیکھتے ہی دیکھتے جوان بھانجا ختم ہو گیا۔ بھائی کی موت نے ماموں میاں کو زندہ درگور کر دیا بھائی کے انتقال کے پانچ ماہ بعد ۲۳ نومبر ۱۹۴۲ء کی سہ پہر کو اچانک رخصت ہو گئے۔

ہملوگ چند دن کے لئے والد کے یہاں حمایت نگر گئے ہوئے تھے صبح کو فون پر بات کی اور اصرار کیا ہملوگ آجائیں چونکہ رات کو کہیں کھانے پر جاتا تھا اس لئے دوسرے دن صبح جانا طے پایا تھا لیکن اسی دن ۳ بجے دوپہر کو نوکر کا فون آیا کہ سرکار ختم ہو گئے وہاں پہونچے تو کچھ بھی نہ پایا۔ پیارے ابا کی چیخ نکل گئی کہنے لگے "یعقوب آج میرے دونوں بازو جھڑ گئے۔ انتقال کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ حضور نظام تشریف لائے بہت روئے نوکروں پر گرجے برسے بھی! اور کہا یہ نہ سمجھنا کہ یعقوب یہاں اکیلے تھے اگر ذرا بھی موت کی وجہ میں شبہ ہوا تو جان کی خیر نہ ہوگی۔ ماموں میاں کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دعا پڑھی رندھی ہوئی آواز میں کہا "یعقوب میں نے تو تمہیں ۳ سال کے لئے بلایا تھا لیکن تم نے دو سال بھی پورے نہ کئے"

ماموں میاں کی خواہش تھی کہ انکو اپنے شہر کی مٹی ملے لیکن اعلیٰ حضرت نے کہا وہ میرے مہمان تھے میں اپنے ہی پاس رکھنا چاہتا ہوں چنانچہ "خطہ صالحین" میں سپرد خاک کئے گئے۔

غریب الوطنی میں موت آئی اور ہم تنہا رہ گئے لیکن جس طرح بیگم امیر حسن اور ڈاکٹر و مسز حیدر علی خاں نے ہمارا ساتھ دیا اور دادی حضرت یعنی آغا چچا کی والدہ نے جس طریقہ سے ہمارے دلوں کو سنبھالا اور غم برداشت کرنے کے قابل بنایا اس کو ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔

اعلیٰ حضرت نے تجہیز و تکفین کی پوری ذمہ داری لی اور جس شان سے ماموں میاں نے زندگی گذاری اسی آن و بان سے رخصت ہوئے اللہ جوار رحمت میں جگہ دے بظاہر زندگی کا ہر آرام اور سکون میسر ہے لیکن دل بجھ چکا۔

ماموں میاں نے بے ماں ہونے کا احساس ہی مٹا دیا تھا لیکن انکی موت نے پہلی بار ماں کا غم دیا یوں معلوم ہوا جیسے ماں آج ہی مری ہیں۔

انکے دوست احباب نے بھی ہماری ہی طرح ماتم کیا سجاد حیدر یلدرم نے پیارے ابا کو پرسے میں لکھا "تمہیں تعزیت نامہ کیا لکھوں ہمدم دیرینہ کی یاد میں تعزیت بھی ہے اور دوستوں کو چھوڑ کر چلے جانے والے کے نام پیام بھی سر یعقوب کی قوم پرستی نہیں احباب پرستی کی یاد تڑپا رہی ہے۔"

اپنے ہمدم دیرینہ کے نام پیام میں کہتے ہیں

اے دوست دیا ساتھ نہ احباب کا تم نے
یہ شرط رفاقت تھی ہمیں چھوڑ گئے تم

مضبوط پکڑتے تھے سرِ رشتۂ الفت
یہ کیا کہ جھٹک کر اسے خود توڑ گئے تم

اے عالم فانی سے نظر پھیرنے والے
ہے کوئی کشش تجھ کو یہاں پھر سے جو لائے

وہ ڈوب گیا جس نے ہزاروں کو اُبھارا
کس کس کو دیا ہمّت عالی سے سہارا

یعقوب سا اب کوئی نہ آئیگا دوبارا
شیرین سخنؔ و دوست نواز انجمن آرا

وہ جس کے لٹا دیتا تھا احباب پہ دولت
وہ پیکرِ اخلاص و تمثالِ محبّت

احباب پرستی کا نمونہ تھے تو تم تھے
احباب فراموش کو شرماؤ تو آکر

یعقوب بھی احباب فراموش ہی نکلا ہو
اس طعنۂ دل دوز کو جھٹلاؤ تو آکر

آرام سے زیرِ لحد جا کے ہو لیٹے
اپنے کو بچائے ہوئے دامن کو سمیٹے

بیکار رہے بیکار رہے اخلاص و محبّت
اب کون نہ ہوگا مزاج جادۂ الفت

وہ مدعیٔ رہبریٔ راہ محبت
کہتا تھا زمانہ کہ وفا اس کی ہے خصلت

یوں چھوڑ چلا جیسے شناسا ہی نہ تھا وہ
اس طرح گیا جیسے کہ آیا ہی نہ تھا وہ

چچا سجاد حیدر نے تو اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا ....
مگر میں وہ زبان کہاں سے لاؤں جو میرے ماموں میاں کا ماتم کر سکے ۔

کتبہ لوح مزار

مادہ تاریخ رحلت مولوی سر محمد یعقوب، مشیر اصلاحات فرمودۂ حضرت بندگان اقدس آصف سابع۔

گفت گلہائے چمن حیف صبائے رفتہ
بوئے نسرین و سمن ہم زقفائے رفتہ
گفتِ عثمان بہ دکن ہے این چہ نصیبِ یعقوب
اے تمہے موت کہ ناگاہ بہ جائے رفتہ

۱۳۶۱ھ

(بمعنی خط اصالحین)

شاہد بھائی

واہ شاہد بھائی کمال کر دیا آپ نے! اللہ رے نازک دماغی درد سر کا بہانا کیا اور چلتے بنے آخر شاعر تھے نا۔ جوبات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ بہانہ بھی کیا تو شاعرانہ کیا۔ تو آج کا واقعہ بڑا عجیب رہا۔ خلاف معمول لیٹے ہی لیٹے میں نے اخبار کے متعلق پوچھا "ہاں آ گیا شاہد صدیقی ختم کئے۔ میں نے پوچھا کون شاہد صدیقی۔ یقین مانئے شاہد بھائی میں سمجھی عالم علی صاحب کے کوئی ملنے والے ہونگے۔ میرے سوال پر انھوں نے حیران ہو کر کہا "کون سے کیا مطلب؟ شاہد صدیقی ایک ہی تو تھے!!

اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اخبار میں آپکی تصویر کے ساتھ آپکے انتقال کی خبر تھی۔ واقعی شاہد صدیقی صرف حیدرآباد ہی نہیں بلکہ ہندوپاک میں بھی ایک ہی تھے اور میں رونے لگی۔ میری خود سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیوں رو رہی ہوں، بالکل اسی طرح رو رہی تھی جیسے کوئی بہن بھائی کے لئے روتی ہے۔ اسوقت میں یہ بھول گئی تھی کہ آپ شاعر ہیں، ادیب ہیں، یا صحافی ہیں مجھے صرف یہ خیال تھا کہ کتنا اچھا کتنا بلند انسان مرگیا، ایک شوہر مرگیا، ایک بھائی مرگیا، میں روتی رہی۔ پھر میں نے دیکھا کہ سب رو رہے ہیں۔ پھر شاہد بھائی بغیر جانے پہچانے میں زینت آپا کے ساتھ آپکے گھر پہونچ گئی۔ جانتے ہیں کیوں؟ آپکی موت کی تصدیق، چاہنے کیلئے راستے بھر دعا کرتی رہی خدا کرے یہ منحوس خبر آپکے دشمنوں نے اڑائی ہو۔ مگر نہیں بھائی آپکا دشمن کوئی ہو ہی کیسے سکتا تھا، لیکن سُنیئے آپکا ایک دشمن تھا جس نے آپکو سچ مچ مار ڈالا تھا اور وہ تھا ہمارا سماج۔ آپ کیا جانیں شاہد بھائی آپکے گھر میں ایک کہرام برپا تھا اور اس ہنگامہ میں آپ ایک نیا جوڑا پہنے آرام کی نیند لے رہے تھے معلوم ہوتا تھا برسوں کا تھکا مسافر اپنی منزل پر پہونچ کر آسودگی کی نیند سو رہا ہے۔

میں پہلی بار آپکے گھر آئی تھی آپ نے اپنے مخصوص انداز میں نہ تو سلام کیا نہ ہی مزاج پوچھا، آخر شاعر جو ٹھہرے جی چاہا کیا نہ جی چاہا تو کس کی مجال کہ جو سلام کر لے۔ میں نے بھابی کو جب پہلی بار دیکھا تھا تو وہ آٹھ دن کی دلہن تھیں اور آج سولہ سال بعد دیکھا تو انکا سہاگ سوچکا تھا انکا سنگار اتر چکا تھا میں نے آپکے گھر پر نظر ڈالی اللہ اکبر کس قدر شاندار مکان ہے۔ اسکے دو کمرے ایک دالان کھپریل کی چھت کچی مٹی بوسیدہ دیواریں، بجلی ندارد میز کرسی تو دور کی بات ہے۔ یہ ایک بہت بڑے شاعر ایک عظیم انسان کا گھر تھا۔ پھر میں نے آپکو دیکھا قربان جائیے اس قناعت پر اور خودداری پر سچ کہتی ہوں شاہد بھائی۔ آپ کی باتیں جینے کی نہ تھیں جینے کے لئے حرص و ہوس چاہیئے۔ دولت کے انبار چاہیئے، نام نمود چاہیئے۔ آپ کے نزدیک یہ سب بہت گھٹیا چیزیں تھیں۔

آپ ان سے بالاتر اور بے نیاز تھے اور یہ سب باتیں جینے کی نہیں ہوا کرتیں۔ اللہ کو اس بے نیازی پر پیار آگیا اور آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپکے اطراف گھر والے جمع تھے اور میں دیوار کا سہارا لئے کچھ دور کھڑی تھی سینما کی تصویروں کی طرح نہ جانے کتنے سین آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔

کہیں مشاعرہ ہو رہا ہے آپ شعر سنا رہے ہیں سننے والے جھوم رہے ہیں کہیں جلسہ ہے آپ مضمون پڑھ رہے ہیں سارا پنڈال زعفران زار بنا ہوا ہے۔ کہیں مجمع کو قابو میں کرنے کے لئے مائک کے سامنے کھڑے پھلجھڑیاں چھوڑ رہے ہیں۔ یہ لیجئے پان کھا رہے ہیں اب چائے کی پیالی ہاتھ میں ہے۔ لیجئے ابا کے سامنے یوں سعادتمند بنے بیٹھے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہیں بیچارے!!

اور پھر بیماری سے اٹھتے ہی ہسپتال سے سیدھے بنجارہ ملنے آئے میں لاہوتی صاحب کا سہارا لئے سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں آپ ایسی حالت میں کیوں آئے تو کہتے یہاں میں رہتی ہوں طبیعت سنبھل جاتی تو آجاتے اس وقت زحمت کیوں

کی۔ لیجئے آپ تو رونے لگے اور اتنا روئے کہ میرا جی چاہا ابّا کی موت کا پرسہ آپ ہی کو دوں۔ اور پھر ایک بار دوپہر کو میرے یہاں آپ کھانے پر آئے آپکے کئی ساتھی بھی وہاں موجود تھے کیفیؔ اعظمی کے اعزاز میں یہ دعوت تھی میں آپکی ہنسی باتوں کو سنتی اور لطف اٹھاتی رہی پھر آپ لوگ رخصت ہونے لگے گیٹ کے پاس ایک بڑی لمبی گاڑی آپ لوگوں کے لئے تیار کھڑی تھی گاڑی کی جسامت پر تبصرہ ہو ہی رہا تھا کہ آپ تیزی سے دونوں ہاتھوں سب کے بیچ سے راستہ بناتے ہوئے آگے نکل گئے پھر پیچھے پلٹ کر بولے بھئی میں آگے بیٹھونگا تاکہ جلدی گھر پہونچ جاؤں آپ کی اس بے ساختگی پر سب ہنس پڑے اور میں کئی دن تک ان باتوں کا لطف اٹھاتی رہی۔

اچانک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا لوگ آپکو ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے۔ طاہرہ بھابی سے کوئی مہر معاف کرنے کے متعلق کہہ رہا تھا اور انھوں نے آنسوؤں اور آہوں کے درمیان کہا وہ تو پہلے ہی دے چکے، کتنے مہان تھے آپ۔!

آج شاہد کے لئے دنیا رو رہی ہے دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں۔ تعزیتی جلسے اور قرار دادیں منظور کی جا رہی ہیں لیکن میں پوچھتی ہوں جو زندگی بھر زندگی کے لئے ترستا رہا جو دل کے ناسوروں میں ظرافت کا رنگ بھرتا رہا اس وقت یہ سب لوگ کہاں تھے؟

اسوقت تو یہ فکر تھی کہ مشاعرہ کی کامیابی کے لئے شاہد صدیقی بہت ضروری ہے۔ مجمع کو قابو میں کرنے کیلئے شاہد کو مائک سنبھالنا چاہیئے۔ فلاں ادیب کی موت پر شاہد سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا۔ شاہد کی ظرافت کی چاشنی فلاں اخبار کی کامیابی کی ضامن ہے۔

شاہد ہر جگہ ضروری تھا لیکن اسکو کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ آرام کی آسائش کی نیند کی، تفریح کی وہ ہر چیز سے محروم تھا۔ اور آج آپ اپنے اخبار کے لئے اپنے رسالے کے لئے یہاں مواد جمع کرنے آئے ہیں۔ وہ کیسے گھر میں رہتا تھا، وہ کیا کھاتا تھا، اسکی کیا عادتیں تھیں، وہ کس طرح لکھتا تھا، اسکے سوچنے کا ڈھنگ کیا تھا۔

شاہد کی نجی زندگی آج پڑھنے والوں کے لئے تفریح طبع کا سامان مہیا کر رہی ہے
اس سے بڑھ کر ہمارا اور کیا مذاق اڑایا جا سکتا ہے۔ تو شاہد بھائی آپ ہی بتائیے
اس میں سے ہم بھابی کے کس سوال کو جھٹلا سکتے ہیں۔

ہمارے پاس سوائے شرمندگی کے کوئی جواب نہیں آج شرمندگی ہے پچھتاوا ہے
مگر لاحاصل۔ پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔!

غزل

شاہد صدیقی

آدمی کی نظروں میں اک نیا اُجالا ہے • آدمی اندھیروں پر فتح پانے والا ہے

زندگی کے مالک ہم زندگی کے خالق ہم • ہم نے اپنے سانچوں میں زندگی کو ڈھالا ہے

جو چھپا کے رکھی ہے لا وہ ساری مئے ساقی • ورنہ آج رندوں کو ہوش آنے والا ہے

دو رنہ صبح کا دھوکہ لوگ خود سمجھتے ہیں • کس قدر اندھیرا تھا کس قدر اُجالا ہے

رات کے گذرتے ہی اور ایک رات آئی

آپ تو یہ کہتے تھے دن نکلنے والا ہے

ڈنڈا صاحب ہماری یادوں میں

شاہد صدیقی نے صریحاً فریب دیا۔ سن گن تک نہ دی اور رحلت فرما گئے۔
ان پر غصہ تھا اور آج تک ہے ابھی تک مشاعروں میں نظریں انھیں کو ڈھونڈ رہی
تھیں کہ ڈنڈا صاحب رخصت ہو گئے۔ انھوں نے جانے سے پہلے اعلان کر دیا تھا
کہ "دیکھو ہم جا رہے ہیں پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی" لیکن نہ جانے کیوں ہم اس اعلان
کو بھی ان کا ایک مذاق ہی سمجھتے رہے انتقال سے آٹھ دن پہلے اخبار میں دیکھا کہ
سرور ڈنڈا شدید بیمار ہیں لیکن یقین مانئے ذرا بھی تو شدت کا احساس نہ ہوا
بس یہی سوچا کہ بیمار ہونے کی ان کو عادت ہے اور جب لیتے ہیں تو انداز شدید
ہی اختیار کرتے ہیں اب کے بھی ٹھیک ہو جائیں گے لیکن افسوس ایسا نہیں ہوا
مذاق نے وحشت ناک سنجیدگی اختیار کر لی۔

مجھے ڈنڈا صاحب کی کیفیت برابر معلوم ہوتی رہی اور میں خود کو مجبور کرتی رہی
وہاں جا کر ان کی عیادت کرنے کے لیے لیکن کامیاب نہ ہو سکی ان کی حالت بد سے
بدتر ہوتی گئی پھر بھی میری ہمت نہ ہوئی۔ سوچتی تھی اس قدر زندہ دل انسان کو کرب میں
کیسے دیکھوں یہ میری کمزوری ہے اور بہت غلط قسم کی کمزوری ہے کہ میں مریض سے اس
وقت دور بھاگتی ہوں جب واقعی اس کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے قریب
ہوں چنانچہ میں ابھی اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی کہ ۲۰ نومبر کی شام کو مجھے فون سے اطلاع
ملی کہ ڈنڈا صاحب چل بسے میرے منہ سے بس ارے نکلا! میں اس خبر کے لیے
تیار نہ تھی۔ نہ جانے کتنی رات گئے تک انھیں کے بارے میں سوچتی رہی اور رہ رہ کر یہ

خیال آتا تھا کہ چالیس سال کی عمر میں تو مرد جواں مرد ہوا کرتا ہے یہ عمر تو پختہ عمر کہلاتی ہے
اس عمر کو پہنچ کر ہی انسان اپنے مقصدِ حیات سے آگاہ ہوتا ہے اور ڈنڈا صاحب سے ایسے
ہی وقت حیات لے لی گئی آخر وجہ ؟ کیا انھوں نے وہ سب وقت سے پہلے حاصل کر لیا جو
اِن کو اب کرنا تھا؟ ہو سکتا ہے اللہ کے بھید انسان سمجھنے سے قاصر ہے انسان کچھ سوچتا ہے
اور ہوتا کچھ ہے ڈنڈا کی موت میں کیا مصلحت ہے اللہ بہتر جانے !!

سرور ڈنڈا محض شاعر ہی نہ تھے وہ فنکار بھی تھے انھوں نے فائن آرٹ کالج سے پنٹنگ
اور کمرشیل آرٹ میں ڈپلوما بھی لیا تھا۔ اس فن میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اگر بجائے شاعری
کے مصوری کو اپناتے تو اس میں بھی اتنا ہی نام کماتے جتنا کہ بحیثیت شاعر کے کمایا۔ !

کمرشیل آرٹ کو کچھ دن معاش کا ذریعہ بھی بنایا لیکن شاید ڈنڈا کو فنون لطیفہ سے روپیہ کمار
حال کرنا پسند نہ آیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر آرٹ تجارت کی منڈی میں آجائے تو پھر وہ آرٹ
نہیں رہتا محض ٹھونس ٹھانس رہ جاتی ہے! سرور ڈنڈا حقیقی معنوں میں آرٹسٹ تھے چنانچہ
انھوں نے آرٹ کی لطافتوں کو آٹے دال کے بھاؤ فروخت کرنے کے بجائے ٹھیکہ داری شروع کر دی
اور یہ کاروبار ان کے لئے بہت مہنگا ثابت ہوا ڈنڈا صحت کے اعتبار سے کبھی بھی تندرست و توانا
نہ تھے چھوٹی چھوٹی بیماریاں چلتی ہی رہتی تھیں ٹھیکہ داری کا بار ان کا جسم برداشت نہ کر سکا وہ تو
ایک حساس فنکار تھے (فنکار کے لئے حساس ہونا پہلی شرط ہے) بھلا ٹھیکہ داری سے ان کو کیا مناسبت
جب سابقہ پڑا جسم و جان دونوں جواب دے گئے۔

ڈنڈا کا کلام پڑھنے سے میں ہمیشہ قاصر رہی کیوں کہ زبان کا تلفظ صحیح ادا نہیں کر پاتی اس لئے
میں ان کا کلام انھیں کی زبانی سننے کی مشتاق رہتی تھی۔ ایک مرتبہ کلام شائع کرنے کی بات چھڑی تو
میں نے کہا خدا کیلئے ڈنڈا صاحب اپنا کلام آپ کتاب کی شکل میں کبھی نہ چھپوائیے گا کیوں کہ میں
نہ پڑھ سکوں گی اور یو۔پی والے کلام کی ریڑھ لگا کر رکھ دیں گے میری رائے میں آپ اپنا کلام اپنی
ہی زبانی ریکارڈ کرائیے ایک ریکارڈ بازار میں آجائے پھر تماشہ دیکھئے کیسی مانگ ہوتی ہے۔

میرے اس خیال پر اچھل ہی تو پڑے کہنے لگے "کیا صحیح بات بولے فاطمہ صاحبہ چلئے ریکارڈ کی بات طے"۔

میں ڈنڈا صاحب کے ساتھیوں سے درخواست کروں گی کہ جہاں جہاں بھی ڈنڈا صاحب کی آواز ریکارڈ کی ہوئی ملے یکجا کرکے ریکارڈ کرواکر بازار میں لائیں تاکہ دکنی ...... زبان کے عوامی شاعر کی آواز دکن کے باہر بھی سُنی جاسکے۔

ڈنڈا کے پڑھنے کا انداز بڑا نرالا تھا جیسا انداز تھا ویسی ہی خوبصورت آواز بھی تھی۔ گردن کو ایک طرف جھکا کر جب وہ ترنّم سے اپنا کلام سُناتے اور ہاتھوں سے ترنّم کے اُتار چڑھاؤ کو ظاہر کرتے تو کلام میں چار چاند لگ جاتے۔ ڈنڈا صاحب مشاعروں میں بہت کم آتے تھے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے "کیا بولوں پاشاہ شاعراں میرے سے خفا ہوجاتیں اس واسطے اپن دور اچ اچھے" اور یہ واقعہ ہے کہ بڑے مشاعروں میں جب کہ ہندوستان بھر کے مشہور شعراء جمع ہوتے عوام کی نظریں ڈنڈا کی متلاشی رہتیں ایک دوسرے سے پوچھتے "یارو اپنا ڈنڈا بھی ہے کیا ـ؟"

اور اگر ڈنڈا نظر آجائے تو لوگ دوسرے شعراء کو زیادہ دیر صبر سے نہ سن سکتے ایک ہلّڑ مچ جاتی پہلے درخواست کی جاتی "جناب ڈنڈا صاحب سے سنوایئے" اور جب درخواست بے اثر ہونے لگتی تو پبلک حکم صادر کرنے لگتی۔ مختلف گوشوں سے مطالبہ شروع ہوجاتا "ڈنڈا کو بلاؤ" "ڈنڈا وانٹیڈ" وغیرہ وغیرہ اور مجمع کو قابو کرنے کیلئے ڈنڈا صاحب لائے جاتے اس وقت ان کی عجیب کیفیت ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے مجرموں کے کٹھرے میں لا کھڑا کیا ہو۔ فرمائشوں کی بوچھار ہوتی ڈنڈا صاحب کی آواز بانسری کی طرح گونجتی سامعین پر جادو سا ہوجاتا آخری شعر ختم کرتے کرتے بھاگ کھڑے ہوتے لیکن گرفتار کرلئے جاتے ایک آدھ چیز سنا کر ڈنڈا صاحب کو کبھی رہائی نہ ملی یہی وجہ تھی کہ ڈنڈا کو عام طور پر شاعروں میں آخر میں سنوایا جاتا وہ اکثر صحت کی خرابی کا عذر بھی پیش کرتے لیکن عوام کے اشتیاق اور خلوص سے ڈنڈا سنانے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ جب کہ یہ سطریں لکھ رہی ہوں ڈنڈا صاحب کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے اور میں سوچتی ہوں کہ انسان کس قدر کمزور ہے نہ ہی آج ڈنڈا صاحب کی آواز واپس بلا سکتی ہے اور نہ ہی ڈنڈا صاحب بلوانے کو ٹال سکے۔ یہ ہے انسان کی حقیقت۔!!

مخدوم صاحب ۔ چند خوشگوار یادیں

دیکھ رہے ہیں مخدوم صاحب آپ کی سترھویں سالگرہ منائی جارہی ہے ہر مکتب خیال کے لوگ جمع ہیں نہ جانے کیوں بار بار دروازے کی طرف نظریں اٹھ رہی ہیں۔ شاید آپ ہی کا انتظار ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والا انتظار۔ کاش ؟

اُسی ادا سے اُسی بانکپن کے ساتھ آؤ
پھر ایک بار اُسی انجمن کے ساتھ آؤ

لیکن انہونی آرزو ہے کیسا نرالا انتظار ہے جس میں اذیت ہی اذیت ہے اس اذیت کو کم کرنے کے لئے انسان کیا کیا جتن کرتا ہے کیسے کیسے بہانے تلاش کرتا ہے اور یوں سمجھئے کہ آج کی یہ تقریب بھی ایسا ہی ایک بہانا ہے جس میں میں پہلی بار قلمی حصہ لے رہی ہوں۔

لیجئے آپ تو ہنس رہے ہیں یہی سوچ کر ہنس رہے ہوں گے کہ "انھیں دیکھو اور ہم پر مضمون لکھتا دیکھو" تو بھی یقین جانیئے میں بالکلیہ آپ سے متفق ہوں ملایئے ہاتھ اسی بات پر۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ پر قلم اٹھانے کی جسارت میں کبھی نہیں کرتی کیونکہ آپ پر کچھ لکھنا میرے بس کا روگ نہیں۔ لیکن کیا کرتی یہ جو آپ کے دوست ہیں نا بڑے راج بہادر بنتے ہیں جی ہاں گور صاحب ان کی راج ہٹ کے آگے پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ ایک مرتبہ فون پر بلا کی ڈنٹ پلائی تھی اور مضمون کا آرڈر دیکر دلی روانہ ہوئے تھے۔ آپ کا دلی سے حکمنامہ وصول ہوا تمھیں سیمینار میں مقالہ پڑھنا ہے (سبحان اللہ) یعنی ہم اور سیمینار میں مقالہ پڑھیں گے! ابھی ہم اس پیار بھرے حکمنامے سے پہلو بچانے کے بہانے ہی تلاش کر رہے تھے کہ لاہوتی صاحب نے فون پر دھونس جمائی کہ "تمھیں پڑھنا ہے" ہم نے بمشکل تمام بے مروتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اپنی زندگی میں کبھی مقالہ نہیں لکھا۔

ہم تو اس کے معنی و مفہوم سے بھی بے بہرہ ہیں کسی پڑھے لکھے کو تلاش کیجئے
کہنے لگے ہماری فہرست تیار ہو چکی ہے تمہارا نام شامل کر دیا گیا ہے تمہیں تو لکھنا ہی ہے گویا تقدیر کا
لکھا مٹایا نہیں جا سکتا۔ مگر مخدوم صاحب میں دونوں کو جل دے گئی اور یادوں کا سہارا لے کر
آپ سے مخاطب ہوں۔

بھلا آپ ہی انصاف کیجئے اگر آپ پر لکھ سکتی تو کیا آج تک خاموش رہتی۔ اس میں شک
نہیں کہ دل میں خواہش ضرور مچلتی رہی کہ کچھ لکھ کر آپ کو نذرِ عقیدت پیش کروں لیکن آپ جیسی
پہلودار شخصیت پر قلم اٹھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ لیکن ذرا ٹھہرئیے آپ کی شفقت، خلوص
اور وضع داری کے نقوش آسانی سے مٹنے والے نہیں یہی نقوش اب خوشگوار یادوں میں بدل
چکے ہیں اور جب سے آپ گئے ہیں یہ یادیں کچھ زیادہ ہی قیمتی بلکہ انمول ہو گئی ہیں۔ بقول وحید صاحب
"جانے والے کبھی نہیں آتے — جانے والوں کی یاد آتی ہے"

آپ کو بھلے ہی یاد نہ ہو مگر مجھے آپ کا پہلا تعارف کل کی بات معلوم ہوتی ہے سنگینہ
کے ابتدائی سالوں کی بات ہے غالباً کوئی کانفرنس ہو رہی تھی باہر سے بہت سے ادیب و شاعر آئے ہوئے
تھے۔ سبطِ حسن اور صفیہ آپا مرحومہ (صفیہ زبیر) ہمارے یہاں ہی بنجارہ ہلز پر مقیم تھے۔ دوپہر
کے کھانے پر تمام مہمان مدعو تھے۔

میں نے ابھی اسکول پاس نہیں کیا تھا اور عمر کا یہ وہ حصہ تھا جب ادب سے زیادہ ادیب
اور شعر سے زیادہ شاعر کی شخصیت متاثر کرتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ کسی مشہور ہستی سے تعارف کیا
ہوتا معراج مل جاتی۔ اور اس دن تو اتنے ڈھیر سارے مشاہیر کو دیکھ کر میں تو جیسے بوکھلا سی گئی۔
ابا تعارف کرا رہے تھے، یہ خواجہ احمد عباس ہیں، یہ کرشن چندر ہیں یہ سردار جعفری ہیں، ارے بھئی
مخدوم یہ میری لڑکی فاطمہ ہے۔ اور نہ جانے کتنے نام ایسے تو کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔
پھر ان سب سے کئی دن ملنا جلنا ہوتا رہا اور میں ابھی بوکھلاہٹ پر قابو پاتی گئی۔ ایسے یادگار موقع پر
آٹوگراف کا نہ ہونا نہایت بد ذوقی کی علامت سمجھی جاتی ہے ہم بھلا کیوں چوکتے! سب ہی نے ہماری

کتاب پر کچھ نہ کچھ لکھا اور آپ نے تو کمال ہی کر دیا آپ نے لکھا تھا:۔

فاطمہ تو ابروئے اُمّت مرحوم ہے

ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

کیا بتاؤں مخدوم صاحب میں اس شعر پر کس قدر اترائی تھی اور اپنی سہیلیوں میں کیسی کیسی شیخیاں بگھاری تھیں اور اندر ہی اندر دل نے پکارا تھا کاش فاطمہ بنت عبداللہ کے بجائے بنت غفار ہوتیں۔ دیکھئے تو سہی بچپن اور جوانی کے دوراہے پر کیسی مضحکہ خیز سوچیں سر اٹھاتی ہیں مسکرا پڑے نا آپ بھلا لائیے ہاتھ۔

یاد ہے آپ کو ایک مرتبہ آپ ہمارے یہاں آکر چھپے تھے شاید اسی کو (UNDER GROUND) کا نام دیا جاتا ہے۔ سارا دن تو آپ یا پڑھتے یا تصویروں کے البم دیکھا کرتے اور شامیں شعر و نغمہ میں ڈوبی ہوئی آتیں ابّا دل کھول کر داد دیتے جاتے اور شعر سنانے کا حوصلہ تیز ہوتا جاتا۔ اب جو میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں ساری یادیں ذہن کے جھروکوں سے نکل کر نظروں کے سامنے گھوم رہی ہیں۔

چھریرا بدن، لمبا قد، کھڑا ناک نقشہ، دبتا ہوا رنگ، ملگجے کپڑے، پریشان بال لاابالی سا انداز، ہاتھ میں سگریٹ اور عمر تو پتہ نہیں ممکن ہے ۳۰ سال ہو یا پھر ۴۰ سال بھی ہو سکتی ہے اس معاملہ میں آپ نے سب ہی کو دھوکے میں رکھا۔ یہ دیکھئے ترنم کی، لہروں پر "انتظار" کی نیا ڈول رہی ہے ؎

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے

سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

ہم یوں دم سادھے بیٹھے تھے کہ کہیں اس سلسلۂ آمد و رفت میں ہماری سانسیں، رکاوٹ نہ بن جائیں۔ پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آہی گئے

سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے

بے اختیار سب کی نظریں خلا میں تیرگئیں جیسے آہٹ پہ کان اور دل میں اضطرابی کیفیت ہو۔ انتظار کی کشتی، ہچکولے کھاتے لگی آس ٹوٹنے لگی۔

صبح نے سیج سے اٹھتے ہوتے لی انگڑائی

او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

آپ شکست ماننے والے کب تھے مایوس ہونا تو آپ نے جانا ہی نہ تھا آپ نے بنیترا بدلا خوشامد اور التجا پر اتر آئے۔ اپنی نیندوں کا واسطہ دے کر آواز پر آواز دیتے رہے ؎

میرے محبوب میری نیند اڑانے والے ✤ میرے مسجود میری روح پر چھانے والے

آ بھی جا تا میرے سجدوں کا ارمان نکلے ✤ آ بھی جا تا ترے قدموں پہ میری جاں نکلے

ماحول پر سناٹا چھا گیا سب مجسم انتظار بن گئے جیسے مسجود اب آیا اور اب آیا!

ایک دن آپ نے "طور" سنائی۔ آپ ترنم ریز تھے۔

دلوں میں اژدہام آرزو لب بند رہتے تھے ✤ نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے

نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے ✤ خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

کتنا پاکیزہ تصور کیسا معصوم اظہار اور پھر خدا کو حاضر و ناظر جان کر پیار کیا جاتے تو وہ کیوں نہ مسکرائے آخر پیار بھی تو خدا کی ایک صفت ٹھہری!

لیکن مخدوم صاحب شکایت رہ گئی کہ باوجود اصرار کے آپ چند دن سے زیادہ نہ ٹھہرے آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں آپ کی موجودگی قاضی صاحب کے لئے پریشانی کا باعث نہ بن جائے اور چپکے سے کھسک لئے۔

آزادی سے ایک آدھ سال پہلے پھر ایک کانفرنس کی دھوم مچی اس مرتبہ کیفی صاحب اور جعفری صاحب ہمارے مہمان تھے۔ برسات کا موسم اور وہ بھی بنجارہ کی برسات کا سماں مت پوچھئے۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ جیسے کیفی صاحب چونک سے پڑے جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔ ڈرے سہمے سہمے انداز میں بولے بھئی ساحر لاپتہ ہو گیا!

قاضی محمد عبدالغفار

سب کی سوالیہ نظریں کیفی صاحب کی طرف اٹھیں اور آپ ہنس پڑے۔ آپ نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا "ساحر کا کوئی قصور نہیں لمبے قد کا ہی تقاضہ ہے" اور ہاتھ بڑھا دیا ملاؤ ہاتھ یہ آپ کی عادت تھی۔ اصل میں تو ساحر برسات کا لطف اٹھانے کے لئے بوندا باندی ہی میں بغیر کہے سنے چہل قدمی کو نکل پڑے تھے!

ساحر صاحب واپس آچکے تھے چائے کا دور چل رہا تھا۔ پیالیوں کی کھنک ہلکی ہلکی پھوار ہواؤں لطیف جھونکے گویا شاعر سے دل کو تڑپانے کا پورا سامان! لیجئے محفل شعر سج گئی خوب سنا اور سنایا گیا اباّ کی فرمائش پر آپ گنگنا اٹھے۔ آپ پوچھ رہے تھے ے

گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا، تری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا
جنوں کی لغزشیں خود پردۂ دارِ رازِ الفت ہیں، وہ جو کہتے ہو سنبھل جاؤ، سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا

گریباں کی بات پھر جنوں کی لغزشیں اور سنبھل جانے پر اصرار بھلا برسات کی رت بھی کسی کو سنبھلنے دیتی ہے آپ سب کو جواب طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور کمرہ واہ واہ کی صداؤں سے گونج رہا تھا۔

اباّ کے حیدرآباد سے چلے جانے کے بعد ایک عرصہ تک یہاں کے لیل و نہار سے بے خبری رہی آزادی کے بعد اباّ کا یہاں آنا جانا شروع ہوا بھلا وہ حیدرآباد آئیں اور گھر پر مشاعرہ نہ ہو۔ آپ کو جیل سے چھوٹے چند دن ہوتے تھے اباّ نے ایک چھوٹے سے مشاعرہ کا اہتمام کر ڈالا طے یہ ہوا کہ سب کھانا بھی ساتھ کھائیں گویا کھانا کھا کر معاوضہ شعر کی صورت ادا کریں۔ اس دن خالص یوپی مارکہ کھانا تیار ہوا تھا۔ آپ نے چپکے سے پوچھا تھا "اچار نہیں کھاتی ہو" میں نے تو سر ہی پیٹ لیا خدا کے لئے مخدوم صاحب قورمہ کے ساتھ اچار کی بات نہ کیجئے۔ پھر میں نے پوچھا کھانے کے بعد چائے یا کافی۔ آپ نے کافی پسند کی مگر کافی کی پیالی دیکھ کر آپ کو سخت کوفت ہوتی کہنے لگے "اگر معلوم ہوتا کہ پیالی اتنی چھوٹی ہوگی تو چائے ہی مانگتا" کافی کے دوران ہی شعر و شاعری کا دور شروع ہوگیا۔ یوں تو آپ نے کئی چیزیں سنائیں لیکن "قید" کا لہجہ تو کچھ اور ہی تھا۔ آخری مصرعہ پر آتے آتے آپ کیسے اداس ہوگئے تھے کچھ پچھتاتے پچھتاتے لہجے میں کہہ رہے تھے ے

مجھے غم ہے مرا گنجِ گراں مایہ عمر

نذرِ زنداں ہوا

نذرِ آزادیِ زنداں وطن کیوں نہ ہوا

اس محفل میں شاہد صدیقی، ڈنڈا، اریب اور ساجد بھی شریک تھے آپ کی تو اب ان سب سے خوب ملاقاتیں رہتی ہونگی اور کیا عجب کے قاضی صاحب وہاں بھی مسکرا مسکرا کر شعر سنتے اور جھوم جھوم کر داد دیتے ہوں گے ہمارے لئے تو یہ محفل یادگار محفل بن چکی ہے۔ آپ سے زیادہ تر ملاقات اُردو ہال میں ہوتی اور وہیں دو چار باتوں کا موقعہ مل جاتا میں ذرا قابل لوگوں سے دور ہی رہتی ہوں لیکن آپ کو میں نے کبھی قابلیت بگھارتے نہیں دیکھا۔ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ کس سے کس قسم کی بات کرنی چاہئیے۔ بات کرنے کا گُر کوئی آپ سے سیکھے۔ بات چیت کا اس قدر ہلکا پھلکا ڈھنگ اختیار کرتے کہ آپ کا مخاطب خواہ مخواہ اپنے کو قابل سمجھنے لگتا۔

آپ کو معلوم تھا کہ میں خواتین کی جا و بیجا طرفداری کرنے میں بدنام ہوں آپ میری دکھتی رگ کو چھیڑنے میں کبھی نہ چوکتے۔ ایک مرتبہ خواتین کی بات چل رہی تھی۔ مجھے چھیڑنے کے لئے آپ نے بڑی معصوم صورت بنا کر کہا "سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت اذاں کیوں نہیں دے سکتی تمہارا کیا خیال ہے؟" ہم اتر آئے طرفداری پر اور کہا۔ "اذاں تو چھوڑئیے پیغمبری بھی عورت کو کب ملی ہے"۔ جناب مخدوم صاحب خدا کے بعد تو عورت کا نمبر آتا ہے کیونکہ وہ بھی تو خالق ہے اگر اللہ میاں عورت کو تخلیق کا کام نہ سونپتے تو وہ موذن بھی ہوتی اور پیغمبر بھی! میرے بپھرنے پر آپ کس قدر لطف اندوز ہو رہے تھے!

غالب صدی کے سلسلے کی کوئی تقریب تھی ایک منسٹر صاحب مسلسل بول رہے تھے جیسے برسوں سے بات کرنے کو ترستے رہے ہوں۔ چند خواتین برآمدے میں چپ چاپ سی بیٹھی تھیں مقابل کی بنچوں پر کچھ حضرات باتوں میں مصروف تھے آپ بھی اتفاق سے ادھر ہی نکل آئے ہم لوگوں کے درمیان بیٹھے، ہوتے بولے "حیرت ہے کہ آپ لوگ باتیں نہیں کر رہے ہیں"! میں نے کہا دیکھ لیجئے "باتیں کرنے

میں ہم ناحق بدنام ہیں آج ثابت ہوگیا کہ باتونی کون ہیں۔

اپنا خلوص تو آپ بس بانٹتے پھرتے تھے ہر ایک کو یہ دعویٰ کہ مخدوم صاحب ہمارے ہیں۔

حیدرآباد سے باہر ہونے کی وجہ سے جشن مخدوم میں شریک نہ ہوسکی۔ اریب صاحب نے لکھا "تمہاری غیر موجودگی کو مخدوم نے بہت محسوس کیا" یقین نہ آیا سوچا اریب نے خوش کرنے والی بات لکھدی ہے لیکن جلدی ہی تصدیق ہوگئی جشن کے بعد پہلی ملاقات میں پہلی بات آپ نے یہی پوچھی "کہاں غائب ہوگئیں تھیں" میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے موقعہ پر جب کہ دور دور سے بڑے بڑے لوگ جشن میں شرکت کیلئے آئے ہوئے تھے میری غیر حاضری کو آپ نے محسوس کیا اور شکایت بھی کی، آپ کے اس احساس کو کیا نام دوں؟

رضیہ آپا سجاد ظہیر میرے پاس ٹھہری ہوئی تھیں عصمت آپا بھی آگئیں اور آپ بھی بڑا پُر لطف وقت گزارا۔ میری طرف دیکھ کر عصمت آپا بولیں یہ تو کچھ اپنی سی لگے ہے۔ آپ نے فوراً کہا۔ اپنی تو ہے ہی قاضی صاحب کی بیٹی اپنی ہی تو ہوی کتنی وضعداری تھی آپ میں اور اس وضعداری کو ساری زندگی نباہتے رہے آپ!

اردو ہال سے واپسی پر اکثر دیر ہو جاتی ہال سے باہر نکل کر آپ پوچھتے کیسے جارہی ہو۔ میں کہتی پیدل آپ کہتے اچھا چلو تمہیں پہنچاتا ہوا چلا جاؤنگا۔ مجھے گھر تک بحفاظت پہنچانا گویا آپ کے فرائض میں داخل تھا۔ راستے بھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ ایک بار میں نے کہا نیا مکان بنایا ہے۔ کوئی اچھا سا نام سوچ کر بتایئے۔ کہنے لگے " بھئی ہمارے ایک دوست نے قرض لے کر مکان بنایا تھا تو اس کا نام "مقروضہ" رکھا تھا۔ پھر آپ نے ہنستے ہوتے ہاتھ بڑھا دیا۔ ملاؤ ہاتھ! نام تجویز کرنے کا وعدہ بھی کیا مگر پورا نہیں کیا یہ شکایت رہے گی آپ سے!

دِلّی جانے سے چند دن قبل اُردو ہال میں آپ سے ملاقات ہوئی میں کچھ فاصلے پر کھڑی تھی پکار کر آپ نے کہا۔

"کل کاغذات میں تمہارا ایک خط ملا۔ تم نے لکھا ہے کہ اگر میری میگزین کے لئے کچھ نہ

لکھا تو اس کا دل ٹوٹ جاتے گا"۔ کس قدر بچکانہ مضمون تھا! میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ بھئی خط کا مضمون سرِ بازار تو نہ سنایئے لوگ کیا کہیں گے۔!! اور یہ آپ سے آخری ملاقات تھی۔ کاش خبر ہوتی تو جی کھول کر باتیں کر لیتی۔ چند یادوں کی یہ چند جھلکیاں ہی میری طرف سے نذرانہ عقیدت سمجھ کر قبول کر لیجئے۔ جشن کے ہنگامے میں بھی ایک چپ پنہاں ہے جب سے

تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چُپ ہے
شاخِ گُل کھوئی ہوئی مرغ خوش الحال چُپ ہے
اُفقِ دل پہ دکھاتی نہیں دیتی ہے دھنک
غمزدہ موسمِ گُل ابرِ بہاراں چُپ ہے

اور اس چپ کی وجہ جانتے ہیں آپ؟

سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے! ایسا کیوں کیا مخدوم صاحب!

نہ میں اور نہ تُو اور نہ وہ جاوِدانی
ازل کے مصوّر کا ہر نقش فانی

مخدوم

ہم تو کھِلتے ہوئے غنچوں کا تبسّم ہیں ندیم
مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے

مخدوم

آغا حیدر حسن مرزا

چند یادیں

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی ایسی ہستی پر قلم اٹھانا بہت آسان ہے جسکو آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہو بے شک بظاہر یہ بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن معاملہ اسکے برعکس ہے مشکل اس وقت آپڑتی ہے جب آپ جانی پہچانی اور عزیز شخصیت پر واقعی لکھنے بیٹھ جائیں۔ اس وقت ہوتا یہ ہے کہ اُسی ہستی سے وابستہ یادیں یلغار کرتی ہیں۔ اور ذہن کے پردے پر سینما کی تصویروں کی طرح گذرنے لگتی ہیں یہی نہیں بلکہ ہر یاد یہ اصرار کرتی ہے کہ پہلے ہمیں لکھو! پہلے ہمیں لکھو! اور اس وقت یادوں کے ہجوم سے چند یادوں کا انتخاب کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

آغا چچا کے ساتھ بیتے ہوئے دنوں کے نقش کچھ یوں ہی زیادہ گہرے ہیں کہ انھوں نے مجھے کچھ زیادہ ہی سر چڑھا رکھا تھا میری کسی بات کو رد کرنے کے بجائے میرے کہنے پر کسی بات کے لئے جی نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہو جایا کرتے تھے مثلاً ایک مرتبہ نظام کالج کے لڑکے ان کی صدارت میں ادبی محفل رکھنا چاہتے تھے لیکن آغا چچا نے معذرت کر لی لڑکے میرے پاس آئے کہ ان کے ساتھ چل کر سفارش کر دوں پہلے تو میں نے ٹالنا چاہا لیکن ان کا اصرار بڑھتا ہی گیا تو میں ان کے ساتھ آغا چچا کے یہاں پہونچی۔ مجھے دیکھتے ہی طالبعلموں سے بولے "اچھا اسے لیکر آئے ہو! خوب میری کمزوری سے کام نکالا! اب انکار تو نہیں کر سکتا ضرور آؤنگا۔ مگر بیٹا مجھے لینے آجانا" یہ تھا انکا محبت بھرا رویہ میرے ساتھ!! اکثر انکی یاد آتی ہے تو "آج" میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور بہت پیچھے چھوٹے ہوئے بچپن کے وہ دن ایک ایک کر کے سامنے آنے لگتے ہیں اور جی بے چین ہو اٹھتا ہے۔

درمیانے سے کچھ نکلتا ہوا قد ــــ چوڑے شانے سنہری لمبے بال بڑی بڑی جنتری مائل شریر سی آنکھیں جن میں شوخی بھی ذہانت بھی محبت اور مروت کے ساتھ ساتھ انسان کو پرکھنے کا سلیقہ بھی۔ چہرہ داڑھی مونچھ سے آزاد۔ شہابی رنگت، لباس میں ریشمی کرتا، ریشم ہی کا چوڑیدار پیر میں سلیم شاہی غرض سرتاپا مغل ہی مغل یہ ہیں وہ آغا حیدر حسن مرزا جن سے میں پہلی بار نہ جانے کب ملی تھی۔ لفظ "پہلی بار" رسماً ہی کہہ لیجئے ورنہ آغا صاحب تو پہلی بار بھی یوں ملتے جیسے برسوں کی ملاقات ہو کچھ اسطرح اور ایسے ڈھنگ سے ملتے کہ انکے حجرے میں داخل ہوتے ہوتے پہلی ملاقات کا تصور ہی مٹ جاتا۔ سلام دعا کی نوبت بھی نہ آنے پاتی ایسی پھلجھڑی چھوڑ دیتے کہ ہنسی کے فواروں میں تکلف کی دیوار ڈھ جاتی ہنسی رکتی تو آنے والے کے خاندان کا حال احوال اس طرح پوچھتے جیسے اسکی سو پشتوں سے واقف ہوں۔ (اکثر واقفیت نکل بھی آتی تھی) بھلا بتایئے پہلی ملاقات کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ــــ

ہم نے بچپن میں اپنے خاندان کے علاوہ ایک اور کنبہ بھی دیکھا وہ تھا علیگی گھرانا یوں سمجھئے کہ اگر کسی نے چھ مہینے بھی علیگڈھ میں پڑھا لیا تو علیگی خاندان کا فرد بن گیا اسکے بعد دنیا کے کسی حصے میں چلے جایئے ایک علیگی دوسرے علیگی کو ڈھونڈ نکالے گا۔ چنانچہ آغا حیدر حسن علیگی حیدرآباد میں موجود تھے اب قاضی عبدالغفار کو حیدرآباد آنے میں کیا قباحت تھی! چلے آئے اور آغا حیدر کے دولت خانے یعنی صدر منزل میں معہ بیوی اور ایک عدد بیٹی کے ڈیرا ڈال دیا ایک آدھ دن نہیں مہینوں رہ پڑے نہ جانے اس زمانے کے دوست کس مٹی کے بنے ہوتے تھے ایک دوسرے سے بیزار ہی نہ ہوتے تھے شام ہوتی تو دو چار اور علیگی جمع ہو جاتے اچھی خاصی محفل سج جاتی کاش اس وقت ہم میں اتنا شعور ہوتا کہ نہ صرف یہ کہ ان محفلوں کا لطف اٹھا سکتے بلکہ ان کی اہمیت کو بھی سمجھ سکتے ذرا سوچئے تو آج اس انتشاری دور میں وہ محفلیں بزرگوں کا ورثہ بن کر ہمارے پاس محفوظ ہو جاتیں ــــ افسوس کس طرح دبے پاؤں وقت نکل گیا ۔۔۔۔!

آغا حیدر حسن کے دوستوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا اور دوست بھی ایسے جو خود بھی کسی نہ کسی حیثیت سے مشہور و معروف شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً سید حسین، خورشید احمد خاں، ڈاکٹر سلیم، خلیق الزماں، غلام محمد، قاضی عبد الغفار، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، غلام پنجتن اور علامہ حسرت بدایونی ان میں سے بعض ہستیاں تو مجھے یوں یاد ہیں جیسے کل کی بات ہو۔

آغا حیدر حسن آثار قدیمہ نہیں بلکہ دلی کی گمشدہ تہذیب کی جیتی جاگتی مورت تھے۔ وہ ایک ایسی کڑی تھے جو ایک نسل کے ورثے کو دوسری نسل سے جوڑتی ہے۔

قلعہ معلّیٰ اجڑ گیا تھا مغلوں کی دلّی پر انگریزوں کو تسلط جمائے تیس سال ہو چکے تھے۔ تاہم در و دیوار سے رنگ اڑا نہیں تھا محبت و مروت کی بو باس باقی تھی۔ تباہی کی داستانیں دلوں میں زندہ تھیں کہ مصطفےٰ خاں کی حویلی میں ۱۴ر اگست ۱۸۹۳ء میں آغا حیدر حسن نے جنم لیا۔ سارا بچپن خاندان کے اکیس پھانسی پانے والوں کی یاد میں دکھ بھری کہانیاں سنتے اور بھولی بسری یادوں کو دوہراتے بزرگوں کی آغوش میں گزرا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آغا جی نے اُن دنوں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے۔ زبان رہن سہن لباس عادات و اطوار اور آداب کو اپنی ذات پر فرض کر لیا اور مرتے دم تک اس فرض کو نبھاتے رہے۔

دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر کے مکتب میں ہوئی پھر دلّی کے اسکول میں داخل کر دیئے گئے اعلیٰ تعلیم کے لئے سر سید کے علیگڑھ پہونچ گئے۔ وہاں کے زندہ دلوں نے انکی بول چال کی فصاحت رہن سہن کی ٹھلساہٹ اور لباس کی رنگینی و نفاست کی وجہ سے انکو آپا جان کا خطاب دیدیا پھر تو یہ ہونے لگا کہ جس کو دلّی کی بیگماتی زبان سے لطف اندوز ہونا ہوتا ان کے کمرے کا رخ کرتا۔ آغا صاحب کے شاگردوں کا کہنا ہے کہ کتاب تو شاذ ہی ہاتھ میں لیتے ہوں انکی تو زبان ہی کتاب تھی فصاحت و بلاغت کو کتاب میں مل سکتی ہے لیکن آغا صاحب کے لہجے کی شگفتگی اور لوچ تو بس انہیں کا حصہ تھی چنانچہ آغا صاحب نے بیگماتی زبان ہی کو اظہار کا ذریعہ بنایا جب لکھنا شروع کیا تو اپنے ساتھیوں کے دیئے ہوئے خطاب کو نام کا جز بنا لیا اور

"آپا حیدر" کے نام سے اپنے کو متعارف کرایا اور اپنے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے لکھنے والوں میں منفرد مقام پایا۔

جب سیاست کی پرچھائیاں علی گڑھ پر پڑھنے لگی تو علی برادران، حکیم اجمل خاں اور گاندھی جی کی مخالف سرکار سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا نتیجہ ظاہر تھا!! دلی اور علی گڑھ دونوں کو خیر باد کہنا پڑا اور دکن کا رُخ کیا۔ یہاں آکر تو ایسے بسے کہ حیدرآباد وطن ثانی بن گیا۔ قدم جمانے کے لئے طبیعت کے خلاف کچھ دن پولیس کی ملازمت کی پھر کالج میں اردو پڑھانے لگے۔ اُس دور کا حال تو انکے شاگرد ہی مزے لے کر سنا سکتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ حیدرآباد کی فضا انکو خوب راس آئی اور کیوں نہ آتی آغا حیدر حسن کا قلعہ معلّیٰ سے قریبی رشتہ تھا درباری آداب و تہذیب انکی گھٹّی میں پڑے تھے حیدرآباد آئے تو یہاں بھی رؤساء امراء کی صحبتیں میسر آئیں۔ یہ فرقِ مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ شاہی خاندان پر بُرا وقت پڑنے کے بعد بھی ان کا رویہ اس خاندان کے ساتھ نہ بدلا درباری آداب کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ یوں تو اپنی ذات سے وہ بالکل قلندر تھے۔ درباداری بھی جلب منفعت کے لئے نہیں بلکہ دل کو خوش رکھنے کا محض بہانا تھا۔ نہ کسی کے عہدے سے مرعوب ہوتے نہ ہی کسی غریب کو دیکھکر منہ پھیرتے امیر غریب میں امتیاز کرنا انکی سرشت ہی میں نہ تھا نجانے کتنے غریب لڑکوں کو انھوں نے تعلیم بھی دلوائی اور روزگار سے بھی لگایا "خیرات اس طرح دو کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو" کی زندہ مثال تھے۔ غریب طالبعلموں میں یقینی جانئے دھوبی اور مہتروں کے لڑکے تک شامل تھے۔ ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگوں میں وہ یکساں عزیز تھے۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ جس سے ایکدفعہ جس طرح مل لئے اخیر دم تک اس انداز میں فرق نہ آیا۔

آغا چچا بے حد شگفتہ مزاج تھے بچوں میں بچہ جوانوں میں جوان بڑی آسانی سے بن جاتے لیکن بوڑھوں میں بوڑھے بن بیٹھنا ان کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ رگ ظرافت ہر وقت پھڑکتی رہتی۔ اردو کی کلاس ہو یا جلسے کی صدارت محفلیں قہقہوں سے گونجتی تھیں۔

بہت پرانی بات ہے اردو ہال میں آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اب سے تیس سال پہلے کے مشاعرے کا تصور کیجئے کیسے کیسے شعراء جمع نہ ہوئے ہونگے شعر کو سمجھکر داد دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ چوٹی کے غزل گو شاعر اس مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوئے مشکل سے آدھا گھنٹہ گذرا ہوگا ایک گوری چٹی بزرگ خاتون تشریف لائیں اور سیدھی اسٹیج پر پہونچ کر صدر صاحب کے پہلو میں جا بیٹھیں۔ گوری بھبوکا اسماۃ کو گہرے رنگ کے صدر کے قریب بیٹھے دیکھکر بھلا آغا چچا کاہے کو خاموش رہتے میں ان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ میری طرف جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولے "لو بیٹا دن رات ایک جگہ ہوگئے" کچھ اسقدر بے ساختہ انھوں نے یہ جملہ کہا کہ میرے لئے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہوگیا میری حالت پر خود بھی کھل کھلا کر ہنس پڑے قضا کے بے رحم ہاتھوں نے سب ہی کو چھین لیا نہ وہ دن رات رہے اور نہ ہی آغا چچا۔!!

میری شادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جس گھر میں ہم رہتے تھے۔ وہ جگہ مجھے پسند نہ تھی۔ ایکدن آغا چچا آئے اور میری جو شامت آئی تو باتوں باتوں میں میں نے کہا "آغا چچا ہمارے لئے کوئی گھر دیکھئے نا" میرے منہ سے بات پوری ہونا تھا کہ وہ لے اڑے ابا کی طرف دیکھکر بولے "دیکھ لیا جوان بیٹی کو گھر میں بٹھانے کا نتیجہ!؟ باوا نے فکر نہ کی تو چچا سے کہنا پڑا کہ اسکے لئے گھر دیکھو" پھر مجھسے بولے "بیٹا صدقے جاؤں ضرور تیرے لئے گھر دیکھونگا کچھ تو تیرے باوا کو غیرت آئیگی" اور پھر تو جتنی دیر بیٹھے مجھے یوں چھیڑتے رہے جیسے کوئی ساتھ کی کھیلی سہیلی ہوں۔ مذاق پر اتر آئے تو کسی کو نہیں بخشتے تھے۔

ایک دن انکی بیٹی شہزادی کے یہاں دن گزارنے پہونچ گئی۔ گیٹ میں داخل ہوئی تو سامنے ہی مل گئے دیکھتے ہی بولے "بیٹا بہنلی کی چاہت میں تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ آج تیس تاریخ ہے!! او رچچا تیرا جاکر آدمی ان تاریخوں میں کس بھلے آدمی کی جیب میں ٹکے ہوتے ہیں ذرا تو چچا کی لاج رکھی ہوتی۔ چلی تو آئیں کہ میں شہزادی کے ساتھ دن گذار ونگی اب کھیلو جواری کی روٹی اور روئیو چچا کی جان کو" تو جناب یوں ہمارا استقبال ہوا دسترخوان پر تو اللہ کا دیا سب کچھ تھا مگر آغا چچا کی زبان کے چٹخارے کی بات ہی کچھ اور تھی۔

میں اکثر اپنے مضامین انکو سنایا کرتی تھی ایک بار میرا ایک مضمون سنکر بولے "تیرے بلا وجہ تم میں دیکھ نہ چھوڑی یہ اچھا کیا کہ اپنی تحریریں چھوڑ گیا کہ تم نے بیٹی اپنے نام سے پڑھ پڑھ کر سنا لی چاہا اور چھپواتی رہ" حوصلہ بڑھانے کا یہ انکا اپنا ایک انداز تھا۔

آغا صاحب جیسے خندہ رو اور شگفتہ مزاج بوڑھے کم ہی دیکھنے میں آئے۔ بیٹی داماد ہندوستان سے باہر تھے۔ آغا چچا اُن سے ملنے گئے تو اُدھر ہی کے ہو رہے۔ دکن کی ایک کہاوت ہے "چیل اُڑی تو بھینس اُڑی" لیکن اکثر چیل نہ بھی اُڑے تو بہرحال بھینس اڑ جاتی ہے کچھ ایسا ہی معاملہ آغا حیدر حسن صاحب کے ساتھ پیش آیا یہ افواہ بڑے یقین کے ساتھ اُڑ گئی کہ آغا صاحب نے ایک جرمن شہزادی سے نکاح کر لیا۔ اب تصدیق کیسے ہو——!

خدا خدا کر کے آغا چچا واپس آئے اور میں ملنے گئی دیکھتے ہی بولے اب چچا یاد آیا میں نے بھی شکایتاً کہا آپ سے بھی تو اتنا نہیں ہوا کہ بھتیجی کو آنے کی اطلاع کرا دیتے غرض شکوے شکایت کے ختم ہوئے تو میں نے پوچھا سُنا ہے آپ نے نکاح کر لیا، مگر بیگم تو کہیں دکھائی نہیں دیں۔ بے حد سنجیدہ صورت بنا کر بولے "بیٹا چھوڑ آیا" انکی جگہ کوئی اور ہوتا تو گھڑت باتیں اپنے متعلق سنتا تو اس تہمت پر چھلا اٹھتا مگر آغا صاحب کے لئے مضحکہ خیز بات بن کر رہ گئی بلکہ ایک لطیفہ انکے ہاتھ آگیا۔

گود میں کھیلی لڑکیاں بڑھیا گئیں تربیت یافتہ جوان بزرگوں کی صف میں شامل ہو گئے خود آغا صاحب کے چہرے پر سفید داڑھی لہرانے لگی لیکن نہ انکے لہجے کی شرارت میں فرق آیا نہ طبیعت کی شوخی میں باتوں میں چہل مرتے دم تک رہی۔ دل کے مرض نے ادھوا کر دیا تھا عزیزوں اور ملازموں سے تیمار داری کے روادار نہ تھے احتیاط اور پرہیز کے نام سے چڑتے تھے آخر ڈاکٹر سے شکایت کی گئی کہ صاحب کسی کی نہیں سنتے۔ ڈاکٹر نے ڈراتے ہوئے کہا آپکو آرام کی ضرورت ہے دل کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے آپکو معلوم ہونا چاہیے کہ دل کا بہت چھوٹا حصّہ باقی رہ گیا ہے۔ جو کام کر رہا ہے اس پر زیادہ بار نہیں پڑھنا چاہئے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیجئے۔ جب ڈاکٹر بات ختم کر چکا تو ہنس کر بولے "عجیب بات بتائی آپ نے

ساٹھ برس سے اوپر ہونے کو آئے کہ میں دونوں ہاتھوں سے دل لٹا رہا ہوں اور تم کہتے ہو اب بھی کچھ حصہ باقی رہ گیا —— ! "ڈاکٹر بے اختیار ہنس پڑا اور کہنے لگا آغا صاحب آپ سے کوئی نہیں جیت سکتا — !

لیکن یہ ہنسنے ہنسانے والا شوخ مزاج بوڑھا جو ہر محفل میں قہقہے بانٹا کرتا تھا اپنی لٹی ہوئی دلی کے غموں کو پہلو میں سمیٹے 5 نومبر ۱۹۷۶ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

انکے ایک مضامین کا مجموعہ "پس پردہ" یادگار ہے اور کئی مضامین مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں کچھ انکے نادر کتب خانے کی کتابوں کے حاشیوں پر یادداشتوں کی صورت میں محفوظ ہیں۔ بچوں کی کہانیاں اور مختلف عنوانات پر خود آغا چچا کی زبانی کئی مضامین آل انڈیا ریڈیو کے پاس ہونگے کاش یہ تمام تحریریں چھپ جائیں ورنہ اب پرانی دلی کا کوئی آغا حیدر حسن جیسا داستان گو تو میری نظر سے نہیں گزرا۔

آغا چچا کے داماد میر معظم حسین صاحب نے آغا چچا کے رہائشی مکان کو میوزیم کی شکل دیدی ہے مختلف کمروں میں انکے جمع کئے ہوئے ذخیرے کو بڑے سلیقے سے الماریوں میں سجادیا ہے کتب خانے کو نئی ترتیب کے ساتھ ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ تحقیق کام کرنے والوں کو استفادہ کرنے کا موقع ملے۔ کتب خانے سے متصل وسیع ہال بنایا ہے جہاں آرام سے بیٹھ کر کام کیا جاسکتا ہے۔ کتب خانے کے علاوہ پرانے لباس، مخطوطات نایاب خطوط اور آغا چچا کی کچھ تحریروں کے مسودے بھی رکھے گئے ہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ جو دلی کی پرانی تہذیب کا پتہ دیتے ہیں۔

معظم بھائی کی یہ لگن بلاوجہ نہیں "وہ آغا" کے لاڈلے شاگرد اور اکلوتے داماد ہیں۔ ان دونوں کا یہ رشتہ قابل رشک بھی تھا اور قابل فخر بھی۔ معظم بھائی بڑی خوبیوں کے انسان ہیں بے حد مہذب شائستہ اور با اخلاق۔ ساری زندگی علم کی خدمت کی اور آج بھی وہ نچلے نہیں بیٹھتے سماج کے کمزور طبقے کو اونچا اٹھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی گفتگو نشست برخاست ان قدروں کی نشاندھی کرتی ہے جو انکو اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملیں ہیں۔

دیکھئے مضمون ختم ہو رہا ہے اور مجھے آغا چچا کی وہ بات یاد آرہی ہے جو ابا پر لکھے میرے ایک مضمون کو سنکر کہی تھی انھوں نے کہا تھا "بیٹا جی چاہتا ہے کل کا مرتا آج [illegible] تو مجھ پر ایسا ہی مضمون لکھتے" میں نے گھبرا کر کہا بھئی ایسی بات زبان سے نہ نکالئے اور یہ بھی تو سوچئے کہ آپکے بعد مضمون لکھا بھی گیا تو سنائیں گی کسے! اور آج مضمون لکھ دیا ہے۔ تو سوچ رہی ہوں یہ کیسی مجبوری ہے [illegible] سنا سکتی۔

ختم شد

[illegible] کا بچہ کادہ دماغ میں چڑھا کر کھانے سے اولاد پھر گئی۔ بغیر [illegible] دیکھے ہی سے پیٹ بھر گئی۔ اچھی! تم کہو گی تو یہی کہ شکل نگوڑی چڑیلوں کی سی اور دماغ پریوں سے بڑھ کر۔ ارے ہے میں خود اس عیب کو محسوس کر کے جھینپ جاتی ہوں مگر میں کیا کروں کوئی میرے بس کی بات ہے۔ دلی بیماری میں میری اٹھان ہی کچھ اس ڈھب سے ہوئی ہے۔ کہ کبھی باہر کسی جوگی ہی نہ رہی۔

"پس پردہ"

آغا حیدر حسن دہلوی!

ادبی محفل

کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کو اپنا ماضی پیارا نہیں! کبھی کبھی تو ماضی کی تلخیاں بھی حال کی دلکشی سے زیادہ خوبصورت لگتی ہیں۔ ماضی کے ایک رنگین لمحے پر حال کی ہزاروں رنگینیوں کو قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔

بھلا سوچئے تو حسین یادوں کے اس ہجوم سے کسی ایک واقعے کو الگ کر کے بیان کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ ایک آدھ ادبی محفل ہو تو لکھوں یہاں تو یادوں کے خزانے میں بیسیوں محفلیں کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ کسی ایک محفل کو اس میں سے علیحدہ کرنا اس مرحلے سے کم نہیں۔

بہرحال ایک محفل کا ذکر کرتی ہوں لیکن پھر بھی یہ وعدہ نہیں کر سکتی کہ اس محفل میں شعر جو حضرات آپ سے ملیں گے وہ سب ایک ہی نشست سے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ان میں دو چار ایسے بھی ہوں جو خیالوں ہی خیالوں میں مختلف محفلوں سے اٹھا کر یہاں لائے گئے ہوں۔ کیونکہ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہو کہ ہمارے گھر پر ادبی بیٹھک نہ جمتی ہو۔ ایسی صورت میں صحیح طور پر یہ کہنا کہ کون شاعر کس محفل میں اور کس میں نہیں تھا، ناممکن سی بات ہے۔

اب سے برسہا برس پہلے کی بات ہے جب ہم لوگ سجادہ پور رہتے تھے۔ اخبار "پیام" کی دھوم تھی "ترقی پسند تحریک" کے لئے تبلیغی کام شروع ہو چکا تھا! شہر میں ہر طرف اردو کانفرنس کا چرچا تھا۔ ہندوستان کے تقریباً ہر حصے سے شعراء اور ادیب جمع ہو چکے تھے۔ کانفرنس کا ہنگامہ بڑی کامیابی کے ساتھ ختم ہو چکا تو شعراء کی موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر پر ایک مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تاریخ اور دن مقرر ہونے کے بعد تیاریاں شروع ہوئیں۔

کھانے پر کیا کیا لوازمات ہونے چاہئیں اس پر ابا سے خاصی بحث رہی۔ ان کا بس چلتا تو نہ جانے کیا کیا پکوا ڈالتے۔ وہ تو کہیے ہم نے ان کی زیادہ چلنے نہ دی لیکن اس سے کوئی خاص فرق بھی نہ پڑا کیونکہ جب تک کھانا میز پر نہ آگیا ابا مختلف سوالات سے ہم کو بوکھلاتے رہے۔ کھانا لذیز ہوا اور افراط سے ہو یہی ان کی دو شرطیں ہوا کرتی تھیں۔

یہ مشاعرہ کسی نواب یا راجہ کے محل میں نہیں بلکہ ایک مزدور کے یہاں تھا۔ آپ ہی فیصلہ کیجیے صحافی مزدور نہیں تو پھر کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہاں وہ لوازمات تو نہ تھے جو مشاعرے کے شایانِ شان ہوتے ہیں مثلاً فرش تو تھا مسند اور شمع نہ تھی۔ شعرا تھے پر یہ مشاعرہ نہ تھا کسی قسم کی سجاوٹ بھی نہ تھی البتہ آسمان پر تاروں نے جھلملاتا شامیانہ ضرور تان رکھا تھا گویا ہماری محفل کی سجاوٹ میں فطرت دل کھول کر حصّہ لے رہی تھی۔

چبوترے کے ایک کونے میں میز پر تن دی گئی تھی بوفے کا انتظام تھا اس لئے کرسیوں پر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی تھی اور یہ طریقہ گویا نہایت غیر شاعرانہ مزاق کی گواہی دے رہا تھا فرش پر اِدھر اُدھر گاؤ تکیے اور کُشن رکھ دیے گئے تھے۔ حُقّے کی جگہ سگریٹ سے پوری کی گئی تھی پان کی گلوریاں سلیقے سے خاص دان میں جما دی گئی تھیں اور شاید یہ گلوریاں تنہا مشاعرے کے لوازمات کی قائم مقامی کر رہی تھیں۔ غرض وقت مقررہ پر مہمان آنا شروع ہو گئے۔ میں عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی جب کہ مشہور ہستیوں سے ملنا بات کرنا باعثِ فخر اور پھر اپنے ساتھیوں میں فخر کے ساتھ اس کا چرچا کرنا مقصدِ حیات ہوتا ہے اس محفل میں بعض ہستیاں ایسی بھی تھیں جنھیں میں پہلی بار دیکھنے والی تھی۔ اسکول کے زمانے میں عموماً شعرا ہی سے واسطہ رہا تھا۔ جیسے جیتے جاگتے چلتے پھرتے شعرا کا تصور کچھ عجیب سی بات معلوم ہو رہی تھی۔

پڑھنے اور سُننے والوں کی فہرست کافی طویل تھی جو نام اب تک ذہن میں رہ گئے ہیں عرض کرتی چلوں اس مشاعرے میں آغا حیدر حسن، جگر مراد آبادی، فضل الرحمٰن،

سکندر علی وجد، ہوش بلگرامی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی اور ایک صاحب سری نواس لاہوٹی شریک تھے۔

ادیب اور شاعر ایک جگہ ہو جائیں تو اس محفل کا رنگ ہی جدا ہوتا ہے۔ ان کی گفتگو سننے میں جو لطف آتا ہے۔ اس کا اظہار الفاظ میں ناممکن ہے ان کی معمولی سی گفتگو بھی ادب پارے کہلانے کے قابل ہوتی ہے۔ جو بات بھی زبان سے نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات صرف وہی کہہ سکتے ہیں۔ سنتے آئے ہیں کہ شاعر کی زندگی ناکامیوں میں بسر ہوتی ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنی نامرادیوں کا مذاق اڑانا بھی خوب جانتا ہے۔ جب ہی تو زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ زندہ دلی کا اعلان معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے سب مہمان آ چکے ہیں۔ آیئے کھانے کی طرف چلیں۔ ارے انھیں بھی دیکھا آپ نے درمیانہ قد سانولا رنگ دبلے پتلے سر پر بالوں کا ڈھیر کرتے پاجامے میں ملبوس جو صاحب بے حد مصروف نظر آ رہے ہیں کبھی ایا سے قریب آکر سرگوشیاں ہوتی ہیں کبھی مہمانوں سے یوں مخاطب ہیں جیسے برسوں کی ملاقات ہے ہمارے گھر کی کوئی محفل ہو ان کا رہنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ کہئے کچھ یاد آیا؟ اتنے اتے پتے کے بعد بھی نہ پہچانیں تو آیئے میں ہی تعارف کرا دوں۔ تو یہ ہیں جناب سری نواس لاہوٹی بے حد مخلص دوست باش اور وضع دار انسان ہیں۔ "گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا" قسم کا مزاج پایا ہے۔ مسلمان صورت مگر ترکاری خور ہندو ہیں چونکہ روشن خیال اور ترقی پسند ہیں کبھی کبھی گوشت کا سالن بھی کھا لیتے ہیں اگر اتفاق سے اروی یا کدو کے دھوکے میں گوشت کی بوٹی منہ میں چلی جائے تو کچھ مذائقہ نہیں سمجھتے۔ ان کے مسلمان صورت ہونے پر ایک واقعہ یاد آیا۔ یوں اسکو لطیفہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہوا یوں کہ پولیس ایکشن کے بعد لکھنؤ جاتے ہوئے گاڑی بدلنے کے لئے اسٹیشن پر اُترے تو چند اشرار نے مسلمان سمجھ کر گھیر لیا۔ اب لاہوٹی صاحب کا اصرار کہ خدا کی قسم میں ہندو ہوں! اور اشرار کی حیرت کہ خدا کی قسم بھی کھاتا ہے اور اپنے کو ہندو بھی کہتا ہے۔ ان کی گلو خلاصی کس طرح ہوئی یہ تو وہی بتا سکتے ہیں میرا مقصد تو صرف ان کا تعارف کرانا ہے۔

پیچھے ہیں تعارف میں رہ گئی اور لاہوٹی صاحب مہمانوں کو کھانے کے لیے کھانے کی طرف پہونچ بھی گئے۔ ذرا دیکھئے اس وقت مہمان اور میزبان میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ سب ایک دوسرے کی خاطر بھی کرتے جاتے ہیں اور باتیں بھی۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو کیا دیکھتی ہوں آغا چچا تنہا کرسی پر بیٹھے گود میں پلیٹ رکھے کھانے میں مصروف ہیں۔ میں نے قریب جاکر پوچھا آپ سب سے الگ کیوں آ بیٹھے" کہنے لگے بیٹا قاضی کی بحث میں یہ دن بھی دیکھنا تھے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ہاتھ پر روٹی دھرے گا تو اللہ قسم ہرگز نہ آتا" میں کچھ جھینپ سی گئی تو ہنس پڑے اور میری جان میں جان آئی۔ آغا چچا کو دو چیزوں سے سخت نفرت ہے' ایک کھڑے ہو کر کھانا دوسرے مائیک پر بات کرنا۔ خیر صاحب کھانا تو جو کچھ تھا سو تھا دلچسپ گفتگو نے کھانے کی لذت کو دوبالا کر دیا بلکہ یوں کہیے کہ کھانا کم اور باتیں زیادہ رہیں۔

کھانا ختم ہوا سب اپنی اپنی جگہ فرش پر براجمان ہیں۔ پان اور سگریٹ کا دور شروع ہو چکا ہے۔ اب مشاعرے کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ خدا خیر کرے یہ تو لکھنؤ کی "پہلے آپ" ہو گئی ہر ایک دوسرے سے اصرار کر رہا ہے۔ کہ پہلے آپ سنائیے۔ خدا کا شکر ہے۔ ابّا نے تصفیہ کر ہی دیا" ارے بھئی مجروح تم سامنے آجاؤ" دیکھا آپ نے میانہ قد کے دبلے پتلے انسان مجروح سلطان پوری ہیں۔ جگر صاحب کے شاگردوں ہی میں نہیں عاشقوں میں ہیں۔ جگر صاحب کس پیار سے مجروح کو دیکھ رہے ہیں۔ مجروح ایک زمانے میں غزل کے شاعر ہوا کرتے تھے ممکن ہے اب بھی غزل کہتے ہوں بظاہر تو وہ خالص فلمی شاعر ہو کر رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف تخلص مجروح ہے بلکہ غزل کا دل بھی مجروح ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے پڑھنے کا انداز جگر سے لیا ہے۔ ترنم سے پڑھتے ہیں لیکن ہلکے ہلکے کہتے ہیں۔

یہ رُکے رُکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں — یوں ہی کب تلک خدایا غم زندگی نبھائیں۔

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ — تیری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں بانہیں۔ آرزو

واہ واہ کے ساتھ دوسری غزل کی فرمائش بھی کر دی گئی جس کا ایک شعر یاد رہ گیا کہتے ہیں۔

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی۔ کبھی ایک چراغ جلا دیا کبھی ایک چراغ بجھا دیا
شعر کی اس بے قراری نے تھوڑی دیر کے لئے محفل کو بھی بے قرار سا کر دیا۔ دیر تک تعریف
ہوتی رہی مجروحؔ اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے۔ ایک منٹ کو سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ابا نے
غلام ربانی تاباں کو اشارہ کیا۔ تاباں ڈیل ڈول رنگ و روغن سے پورے پٹھان ہیں۔ جس
کی جھلک کبھی کبھی اشعار میں بھی نظر آتی ہے۔ تحت الفاظ پڑھتے ہیں، توجہ سے سننے کہتے ہیں۔
ہجوم رسمِ راہِ دنیا کی پابندی بھی ہے۔ غالباً کچھ شیخ کو زعم خردمندی بھی ہے
عجلتوں سے سازشیں بھی کر رہا ہے آسماں۔ ہم چمن والوں کو حکمِ آشیاں بندی بھی ہے۔
دوسرے شعر پر سب ہی چونک پڑے سازشوں کا انکشاف ہو چکا تھا۔ کئی بار اشعار دوہرائے
گئے، تاباں اپنی جگہ پہونچ چکے تھے۔

دبلا پتلا میانہ قد سلونا رنگ ناز ک ناک نقشہ بے حد شرمائے ہوئے جو صاحب
سامنے آئے ہیں۔ آپ پہچانتے ہیں؟ جی ہاں یہ اسرار الحق مجاز ہیں۔ یہ کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں
کرتے بشرطیکہ پی نہ ہو۔ آج کچھ جھینپے ہوئے بھی ہیں۔ کل کیفی صاحب نے جب ابا کا پیام
ان کو پہونچایا تو انھوں نے کہا تھا، "قاضی صاحب کچھ ٹھیک آدمی نہیں ہیں نہ پیتے ہیں نہ پلاتے
ہیں، وہاں جا کر کیا کریں گے"۔ اور آنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجاز ایسی بات صرف پی کر ہی کرتا ہے
مجاز کے سامنے آتے ہی فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ کوئی کہتا اعتراف سناؤ کسی طرف سے
"از آئی تعارف" ہونا چاہیئے۔ ان کے دوستوں نے کہا مجاز آوارہ سناؤ اور مجاز سنانے لگے
ہر طرف سے داد مل رہی تھی۔ لیکن مجاز یوں سنا رہے تھے جیسے وہ خود نہ ہوں ان کا بیان نکلا ہو۔
جب اس موڑ پر پہونچے کہ:

راستے میں رُک کے دم لے لوں میری عادت نہیں۔ لوٹ کر واپس چلا جاؤں میری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں ـــ اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں۔
تو ساری محفل جھوم اٹھی۔ آہ۔ آج مجاز ہم میں نہیں "اس کی وحشتِ دل نے اس کو جینے نہ دیا۔

اگر "وحشت" کچھ صبر سے کام لیتی تو خدا جانے مجازؔ شعر کی کن بلندیوں تک پہونچتا۔ اس کے بعد ایک غزل سنائی جس کا ایک شعر پوری غزل پر بھاری ہے سُنیئے۔

یہ رنگ بہار عالم ہے کیوں تجھ کو فکر ہے اے ساقی۔ محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

کاش مجازؔ کو اندازہ ہوتا کہ اس کے جانے سے محفلیں کتنی سونی ہو گئی ہیں۔ اس کو کیا خبر کہ بہت سے آنے والوں میں ایک بھی تو ایسا نہیں جو محفل میں اس کی جگہ لے سکے۔

ان کے بعد قرعہ سردار جعفری کے نام پر پڑا۔ درمیانے سے کچھ اونچا قد چھریرا بدن کھلتا ہوا رنگ، بال منتشر، حال پریشان، اپنے حلیے سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن آنکھوں میں قلم کی چمک، باتوں میں عزم و ارادے کی جھلک جدید شاعری کے رسیاں ہیں۔ لیکن چونکہ محفل پہ غزل کا رنگ چڑھ چکا تھا ماحول کی مناسبت سے انھوں نے بھی غزل چھیڑ دی۔ یہ تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ ایک ایک لفظ کو بڑے ادب و احترام کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ عشق کی تپش کا احوال انھیں سے سُنئے۔

عشق کا نغمہ جنوں کے ساز پر گاتے ہیں ہم — اپنے غم کی آنچ سے پتھر کو پگھلاتے ہیں ہم
جاگ اٹھتے ہیں تو سولی پر بھی نیند آتی نہیں — وقت پڑ جائے تو انگاروں پہ سو جاتے ہیں ہم
دفن ہو کر خاک میں بھی دفن رہ سکتے نہیں — لالہ و گل بن کے ویرانوں پہ چھاتے ہیں ہم

غزل کی آڑ میں بہت کچھ کہہ گئے۔ سمجھنے والوں نے خوب خوب داد دی۔ سردار جعفری کے ہونٹوں میں سگریٹ پہونچ چکا تھا۔ غزل کے نئے پن نے محفل کو ایک راہ سجھا دی تھی۔

تعریفوں کا سلسلہ رکا تو کیفی صاحب آگے کھسک آئے۔ کھسک کا لفظ انھیں پر جچتا ہے۔ جی چاہتا ہے ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دو جب دیکھو نیند کی کیفیت طاری ہے۔ بال ہیں کہ آنکھوں میں گھسے جاتے ہیں۔ اتنا نہیں ہوتا کہ ہاتھ سے پیشانی کے بال ہی ہٹا دیں۔ لطف تو یہ ہے کہ یہ اس روز نے پیئے ہوئے نہیں تھے لیکن پہلی بار دیکھنے سے یہ گمان ہوتا تھا کہ نہ صرف پیئے ہوئے ہیں بلکہ چڑھائے ہوئے ہیں۔ دبلے پتلے، لمبا قد، چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں غضب کی چمک اب جو یہ سامنے آئے

تو مجھے یہ خیال آیا کہ اس قدر بھولے انسان خدا جانے آواز نکالنے کی بھی زحمت گوارا کریں گے یا نہیں۔ لیکن سامنے وہ تو جب سنانے پر آئے تو ایسا معلوم ہوا کہ ساری چستی اشعار سنانے ہی کے لئے محفوظ کر رکھی تھی۔ ان کی نظم کا عنوان تھا "نئی جنت" کہتے ہیں۔

الٹ کر ایک ٹھوکر میں ستم کا راج رکھ دیں گے۔ اٹھا کر اپنی بستی کو پھر معراج رکھ دیں گے۔

وہ اک گل کی حکومت تھی کہ گلشن لٹ گیا سارا — ہم اب کی غنچے غنچے کی جبیں پر تاج رکھ دیں گے۔

ہم اب کی تنکے تنکے کو چمن بندی سکھا بیٹھے گے — نئے ہندوستان میں ہم نئی جنت بنائیں گے۔

عزم و ارادے کو انداز بیان نے جیالا بنا دیئے۔ آج گو بظاہر وہ جسمانی طور پر مفلوج ہیں لیکن عزم و ارادے اسی طرح مضبوط ہیں۔

ان کے بعد پریم دھون نے گیت سنائے جو میرے ذہن میں نہیں ہیں لیکن یوں بڑے سجیلے اور سریلے تھے۔ فلموں کے ذریعے گیت سننے کو مل جاتے ہیں لیکن ان کی زبانی سننے کا لطف کچھ اور ہی تھا۔

ان کے بعد ساحر لدھیانوی آگے بڑھے۔ اس وقت ایسے مشہور تو نہ تھے البتہ شہرت کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ انھوں نے کئی چیزیں سنائیں۔ ایک بند اس زمانے میں بہت مشہور ہوا تھا کہتے ہیں:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

کبھی کوئی برا مانے یا بھلا میں نے یہ سنا تو خیال آیا کہ عجیب جل ککڑ شاعر ہے۔ محبت سے دولت کو کیا سروکار۔ محبت کی دو دلوں جگہ حکمرانی ہندوستان کے ایک عظیم شاہکار پر اتنا بڑا بہتان شاعر ہی کو زیب دیتا۔ دولت کے سہارے اگر تاج محل تعمیر ہوا تو تعمیر کے بہانے کتنے گھروں کے چراغ روشن ہو گئے۔ شاعر یہ بات بھول کیوں گیا۔ خیر اپنا اپنا خیال ہے۔

ان کے بعد گی سکندر علی وجد تشریف لائے۔ اپنی وضع قطع اور نفاست کے اعتبار سے

یہ دوسرے شاعروں سے ذرا الگ ہیں۔ جدید شاعری سے ان کے ستارے نہیں ملتے۔ نظم اور غزل ان کا میدان ہے۔ دیکھنے میں بہت نازک اور اندازہ کہتا ہے کہ آواز بھی اسی مناسبت سے ہوگی لیکن جب سنانے پر آئے تو میں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا کہ یہ گرجدار آواز کہاں سے آئی۔ ارے یہ تو وجد صاحب ہی پڑھ رہے ہیں ترنم سے پڑھتے ہیں، بڑے یقین سے کہتے ہیں۔

ہمت کے چراغوں سے روشن ہر راہ گذر ہو جاتی ہے ؛ پر عزم نگاہ راہ رواں سامان سفر ہو جاتی ہے۔
دل رنگ بدلتا ہے پیہم چھٹتا ہے غبار شادی و غم ؛ ہو وصل کی شب یا ہجر کی شب یا سحر ہو جاتی ہے۔
سے شوق جہاں آشفتہ ہو آرام کی صورت کیا ہوگی ؛ دل اور پریشان ہوتا ہے تسکین اگر ہو جاتی ہے۔

رنگ تغزل اور وجد کے ترنم نے مل کر محفل پر وجد کی کیفیت طاری کر دی۔ ان کے بعد یہ دیکھئے کون سامنے آیا۔ لمبا قد، دبتا رنگ، کھڑا ناک نقشہ، سگریٹ کی کثرت سے ہونٹ سیاہ، لمبے لمبے بے ترتیب بال، علگجے سے بدھسی لباس میں ملبوس وہ سی دل کا ملاک کچھ سمجھے؟ جی ہاں یہ ہیں مخدوم محی الدین اس زمانے میں نوجوان شعرا میں ان کا شمار تھا پہلے "دو شالے" کی جگہ "سرخ پرچم" نے لے لی ہے۔ اب یہ عوامی شاعر تھے۔ ان کا انداز ترنم بھی خوب تھا جب ان سے کلام سنانے کی فرمائش کی جاتی تو ترنم کی شرط بھی لگائی جاتی، انھوں نے اس محفل میں سنایا تو بہت کچھ لیکن اباّ کی فرمائش پر یہ چند شعر سنے کچھ سوال ہیں بن پڑے تو جواب دیجئے کہتے ہیں۔

گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا ـ تری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا
جنوں کی لغزشیں خود پردہ دار راز الفت ہیں ـ جو کہتے ہو سنبھل جاؤ سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا
نہ جانے سنبھل جاتے تو کیا ہوتا! کس قدر عجیب بات ہے کہ اب ہم نہ ان سے کوئی فرمائش کر سکیں گے اور نہ ہی شرط لگا سکیں گے۔ جب ان کا ساٹھ سالہ جشن منایا گیا تھا تو میں نے سوچا تھا جب مخدوم صاحب اسّی سال کے ہوں گے تو ساٹھ سال کے نظر

آئیں گے مگر وہ تو نوجوان ہی چل بسے۔

ذرا ان سے بھی مل لیجئے یہ چھوٹے سے قد کا بال بکھرائے منہ میں پان دبائے ضرورت سے زیادہ سعادت مند نظر آنے والا کوئی جانا پہچانا تو نہیں؟ یہ ہیں شاہد صدیقی ان کو بھی ہم رو چکے ہیں یہ اس زمانے میں ترنّم سے پڑھتے تھے اور جگرؔ کے ترنم سے متاثر تھے۔ آخر زمانے میں ترنّم ترک کر دیا تھا۔ ان کو جاننے کے لئے دو شعر ہی کافی ہیں کہتے ہیں۔

کبھی دل نے راہِ غم میں بہت اشک خود بہائے ـــ کبھی وہ مقام آیا کہ حیات مسکرا دی

یہ غرور بے حقیقت یہ سرور بے لطافت ـــ مجھے آج تو نے ساقی کوئی اور شے پلا دی

ترنّم نے غزل کو بالکل ہی غزل بنا دیا۔ شاہدؔ کی موت اردو ادب کے لئے ایک حادثہ ہے۔ جس کی تلافی موجودہ دور میں ناممکن ہے۔ جب یہ خیال آتا ہے۔ کہ شاہد اب کبھی کسی محفل میں نظر نہ آئے گا تو اس پر غصہ سا آتا ہے۔ مرنا تو ہر ایک کو ہے پھر آخر ایسی جلدی کیا تھی سکون سے جاتا تو کیا تھا۔

شاہد صدیقی کے منہ میں گلوری پہونچی اور ... فضل الرحمٰن صاحب کی باری آگئی یہ کسی طرف سے بھی شاعر نظر نہیں آتے جب سامنے آئے تو یقین نہ آیا لیکن جب سنانے لگے تو ماننا پڑا کہ شاعر یوں بھی ہوتے ہیں اُس دن موڈ میں تھے اور نہ بھی ہوتے تو فضا کچھ ایسی تھی کہ موڈ بنتے کتنی دیر لگتی ذروں کا ناچ نہ دیکھا ہو تو ان کے الفاظ میں دیکھئے کہتے ہیں۔

یہ شگوفے حسینوں کی جن میں ادا ـــ یہ نسیم کا رقص یہ موج صبا

یہ پرندے یہ سیت کے مارے ہوئے ـــ نہیں بجھی پریم کی جن سے اگن

یہ سہانے نظارے یہ پیاری زمین ـــ وہ فضائیں فلک کی وہ چرخ بریں

یہ ہے برق کے ذروں کا ناچ پیا ـــ وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن

فضل رحمٰن صاحب تحت اللفظ پڑھ رہے تھے لیکن الفاظ میں غضب کا لوچ اور آواز میں ترنّم جیسی لچک نے کچھ عجیب ڈھنگ پیدا کر دیا تھا۔ جس کو نہ

ترنم کہہ سکتے ہیں نہ تحت اللفظ بہرحال دونوں کے درمیان جو بات بھی تھی خوب تھی جب واہ واہ کا شور دھیما پڑا تو ایک لچک دار آواز آئی "واہ میاں واہ لطف آگیا" ایسا معلوم ہوا جیسے آغا شاعر ہو گیا ہو یہ آغا چا کی آواز تھی ساری محفل قہقہہ زار بن گئی۔ فضل الرحمن صاحب بڑی احتیاط سے اپنی جگہ لے چکے ہیں۔ سب کی نظریں جگر صاحب پر ہیں۔ مگر یہ کیا یہاں تو مرادآبادیوں کے درمیان کچھ سرگوشیاں ہو رہی ہیں سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ قاضی صاحب کے چہرے کا رنگ بتا رہا ہے کہ "بڑے پھنسے" اور کچھ شرمائے سے بھی ہیں جگر صاحب نے ابا سے بھی سنانے کی فرمائش کر دی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ابا نے کبھی کسی محفل میں کلام نہ سنایا تھا بلکہ سچ پوچھئے تو آج سے پہلے مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ابا شعر کہتے ہیں اصرار بڑھتا جا رہا ہے ابا کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑے یہ لیجئے مسکراتے ہوئے سامنے آہی گئے۔ جگر صاحب کی توجہ چاہتے ہوئے گویا ہوئے دل کی کہانی کو ختم کرنے کی اس نرالی خواہش کی داد دیجئے۔

کہانی دل کی آخر ایک شب یوں ختم ہو جائے — کہ جیسے طفل نادان روتے روتے تھک کے سو جائے
کہیں سے ایک شب اے چشم گریہ مجھ کو تو لادے — وہ ایک آنسو جو نقش زندگی کو آ کے دھو جائے
عمل فطرت کا ہے اس جلوہ گاہ دہر میں ایسا — کہ بس اک لمحہ کھولے آنکھ غنچہ اور سو جائے
فریب زندگی راہ محبت سے نہ بھٹکا دے — متاع زخم دل اس کی امانت ہے نہ کھو جائے

غزل ختم ہوئی بڑی دیر تک داد ملتی رہی اور ابا نہ جانے کہاں دور خلاؤں میں کچھ ڈھونڈتے رہے۔

اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی جی نہیں نہیں میرا مطلب جگر مرادآبادی سے ہے یہ دیکھئے پسینہ پوچھتے ہوئے جگر صاحب سامنے آگئے ان کا ہر انداز شاعرانہ ہے۔ ٹوپی سے باہر نکلی ہوئی بالوں کی لٹ یہ بھی ایک ادا ہے۔ کچھ کچھ سفید ہو چلی ہے عجب نہیں کہ دھوپ سے سفید ہو گئی ہو۔ یہ نہایت سنجیدہ انسان ہیں خصوصاً جس محفل میں خواتین ہوں ان کی متانت اپنی حدوں سے گزر کر بوجھ معلوم ہونے لگتی ہے۔ دیکھئے ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔

سب ہی ہمہ تن گوش ہیں۔ حسب عادت جگر صاحب پہلے کچھ گنگنائے پھر منہ ہی منہ میں الفاظ ترنم میں دوہرائے پیچھے "وہ ترنم سے پڑھنے لگے جذبۂ بے اختیار کے کرشمے انھیں کی زبانی سنئے کہتے ہیں۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آہی گیا
ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ دیو — میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آہی گیا

شاہد اور مجروح کا بس نہیں چلتا کہ کس کس طرح ان کی بلائیں لے لیں ایک سماں بندھ گیا ایک کے بعد دوسری غزل چھڑتی رہی "آخر غزل کے اس شعر کا کیا کہنا:

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک — ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے۔

کتنا سادہ اور بے ساختہ شعر ہے "ایک طرف التجا اور خوشامد دوسری طرف کوفت اور جھنجھلاہٹ کا اظہار سبحان اللہ سنگ دل محتسب کا دل بھی موم ہو گیا ہوگا۔

جگر صاحب کے کلام مشاعرہ اختتام کو پہونچا ہم ارے گھر کی شاید یہ آخری محفل تھی "سوچتی ہوں اس چمن کے کتنے ہی پھول مرجھا گئے "قاضی صاحب "جگر "مجاز "شاہد "مخدوم "آغا حیدر "اب کبھی جیتی جاگتی محفلوں میں شریک نہ ہوسکیں گے "یہ کتنا تکلیف دہ خیال ہے لیکن اس خیال کی تسلی کو یادیں کیا کچھ کم ہیں۔

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسا لی ہیں بستیاں

رضیہ سجّاد ظہیر

رضیہ آپا سے کتنی یادیں وابستہ ہیں ان کا حساب رکھنا آسان بات نہیں جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو ۱۹۴۸ء کا وہ زمانہ نظروں میں گھوم جاتا ہے جب میں کرامت حسین گرلز کالج میں پڑھا کرتی تھی اور رضیہ آپا ہمیں اردو پڑھاتی تھیں کیسی بے چینی سے ہم ان کے گھنٹے کا انتظار کرتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا ڈھنگ ہی کچھ ایسا تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے دل و دماغ پر سحر کر دیا ہو۔ اندازِ بیان اتنا خوبصورت تھا کہ ایک ایک لفظ ذہن میں پیوست ہوتا چلا جاتا گھنٹہ ختم ہو جاتا اور ہم لوگ سحر زدہ سے بیٹھے رہ جاتے۔

رضیہ سجّاد ظہیر بڑی حوصلہ مند خاتون تھیں ان کے میاں کے حصے میں شہرت آئی اور ان کے حصے میں سختیاں۔ اس وقت وہ تین چھوٹی بچیوں کی ماں تھیں اور معاشی الجھنوں میں گرفتار۔ لیکن جس طرح تنہا رہ کر مردانہ وار حالات کا مقابلہ کیا اس کی بہت کم مثالیں ملیں گی۔ نہ تو کبھی بچیوں کو کسی کمی کا احساس ہونے دیا اور نہ ہی دنیا والوں کو یہ معلوم ہو سکا کہ اُن پر کیا گذر گئی۔ نہ صرف یہ کہ وہ بہت خود دار تھیں بلکہ دکھڑا رونے والوں کو بزدل کہتی تھیں۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہنا ان کی عادت تھی۔ اور اسی شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی نے ہمیشہ انکی محرومیوں کی پردہ پوشی کا رول ادا کیا۔ ایک عرصے تک انھوں نے ایک چھوٹے سے کوٹھری نما کمرے میں گذر کی (مجھے یاد پڑتا ہے ان کی زندگی کے اس دور کو کہانی کی شکل میں کسی رسالے میں پڑھا ٹھیک سے یاد نہیں کہ افسانہ نگار کون تھے

ممکن ہے باقر مہدی رہے ہوں جن کو وہ بیٹا کہا کرتی تھیں) کالج سے کبھی وقت پر انھیں تنخواہ نہیں ملی مالی دشواریوں کا ہمیشہ سامنا رہا لیکن اپنے خوش حال عزیزوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے کسی نے نہیں دیکھا۔ بہرحال اس کوٹھری سے نکلیں تو ان کے حصے میں سسرال کی وزیر منزل کے شاگرد پیشے (OUT HOUSES) آئے جن کی اکثر کھڑکیاں اور دروازے بے کواڑ تھے۔ یہ بات ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء کی ہے جب میری بہن وزیر منزل کے سامنے والے مکان میں رہتی تھیں اور میں ان سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ جس دن میں وہاں پہنچی اسی شام رضیہ آپا سے ملنے گئی تو انھوں نے یوں مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا جیسے بچھڑی ہوئی بیٹی مل گئی ہو اس کیفیت کو آج بھی محسوس تو کر سکتی ہوں میں مگر الفاظ نہیں دے سکتی! اس زمانے میں رضیہ سجاد ظہیر کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا کالج سے جب شام کو گھر آ کر کھانا پکانا دھونا دھلانا بچیوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کی پڑھائی میں مدد کرنا ان کا معمول تھا اور جب رات کو فراغت پا جائیں تو کاغذ قلم لیکر بیٹھ جائیں۔ کبھی میں پہنچ جاتی تو وہ جو لکھتی تھیں اصرار کر کے سنتی کبھی وہ ہمارے یہاں آ جاتیں (دونوں گھروں کے بیچ میں ایک پتلی سی سڑک تھی) اور اپنی کوئی نہ کوئی کہانی ہم سب کو سناتیں۔ سجاد ظہیر صاحب یوں تو پاکستان سے آ چکے تھے لیکن ان کا زیادہ وقت لکھنؤ سے باہر ہی گذرتا تھا اس لیے میرا ان سے صرف اتنا ہی تعارف تھا کہ میں واضحی صاحب کی لڑکی ہوں۔

اس زمانے میں رضیہ آپا چار بچے کی تیاری میں تھیں۔ میں دو ماہ لکھنؤ میں گذار کر حیدرآباد آ گئی پھر میں نے سنا کہ رضیہ آپا بھی ملازمت چھوڑ کر دلی چلی گئیں اتفاق سے میرا دلی جانا ہوا تو میں ان سے ملنے گئی۔ وہ محلہ "حوض خاص" میں رہ رہی تھیں بیمار تھیں بہت دبلی ہو گئیں تھیں مجھے دیکھتے ہی دونوں ہاتھ پھیلا دیئے میں ان کے سینے سے لگ گئی انھوں نے بتایا کہ شکر آنے لگی ہے خون کا دباؤ بھی بڑھ گیا ہے حال سن کر دل کو بڑا دھکا لگا۔

لیکن اللہ نے فضل کیا۔ اور وہ پھر اپنے مشاغل میں منہمک ہوگئیں۔

پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ رضیہ آپا کو ساہتیہ اکیڈمی کے خواتین کے سیمنار کے سلسلے میں حیدرآباد آنا ہوا وہ صرف چار دن کے لئے آئیں اور میرے پاس ٹھیریں۔ یہاں ان کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی سب ہی ان کو اپنا مہمان بنانا چاہتے تھے لیکن سب سے انھوں نے ایک ہی بات کہی کہ "بھئی یہ تو میری بیٹی ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں حیدرآباد آؤں اور اس کا گھر چھوڑ کر کہیں اور ٹھیروں۔!

وہ دن اور ان دنوں کا ایک ایک لمحہ ذہن میں یوں محفوظ ہے جیسے البم میں تصویریں۔ بس البم کھول کر بیٹھ جائیے۔ یہ رہا اردو ہال اردو مجلس نے رضیہ آپا کے اعزاز میں ادبی محفل کا اہتمام کیا تھا۔ رضیہ آپا کا کہانیاں سنانا اور سامعین کی وقفہ وقفہ سے واہ واہ کی صدائیں۔ اور کہانی "پریوں کا دیس" ہال میں سناٹا سب ہمہ تن گوش کہانی کے انجام کے منتظر۔! کاش ایسا ہوسکتا کہ وہ ننھی سی جان پریوں کے دیس سے بھٹک کر کسی گوشے سے رضیہ کا روپ دھارن کر کے نکل آتی۔!

دن بھر ملنا جلنا اور ادبی اجلاسوں میں شرکت۔ رات کو کھانے کے بعد میرے کمسن لڑکے کو کہانیاں سنائیں آپ نصرت کو ان کا چہرہ یاد نہیں ہے لیکن کہانیوں کا لطف آج بھی یاد ہے غرض 24 اپریل سے 28 اپریل تک کے وہ چند دن یادگار بن گئے۔

مجھے خط میں لکھا "حیدرآباد سے آنے کو دل نہیں چاہتا تھا مگر کیا کریں کہ یہ طرح طرح کے آفاتِ ارضی وسماوی بھلے آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتے"

رضیہ سجاد ظہیر ترقی پسند بھی تھیں روشن خیال بھی لیکن ان کے پاس کچھ حدیں مقرر تھیں اچھی روایات اور تہذیبی قدروں کا انھیں بڑا پاس تھا اور ان کا دل سے احترام کرتی تھیں۔ مجلسوں میں بھلے ہی نہ جاتی ہوں مگر ماہ محرم کا احترام پوری عقیدت کے ساتھ کرتی تھیں بزرگوں کے طور طریقوں اور خیالات کی عزت اور ان کی خوشنودی کو اپنا مقدس فریضہ سمجھتی تھیں رضیہ آپا

کے گھرانے میں پردے کی بڑی پابندی تھی شادی کے بعد پردے سے باہر آئیں لیکن جب تک ان کے والد حیات رہے وہ میکے جاتیں تو اسٹیشن پر برقعہ پہن کر ہی اترتیں۔ اور جب تک رہتیں پردے کا اہتمام کرتیں۔ لیکن ان روایات کو کبھی کسی پر لادنے کی کوشش نہیں کی ان کی ہم عصر خواتین میں زیادہ تر ایسی تھیں جنہوں نے نہ صرف پرانی روایات کو توڑا بلکہ ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ رضیہ آپا نے اس بغاوت پر اعتراض بھی نہیں کیا اور اپنا دامن بھی بچائے رکھا۔ اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دی صحیح اور غلط کا فرق بھی سمجھایا ساتھ ساتھ ان کو یہ اختیار بھی دیا کہ اپنی زندگی کے راستے خود تلاش کریں۔

۱۹۶۷ء میں دلّی میں رضیہ آپا سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ صحت کافی خراب ہو چکی تھی خون کے دباؤ اور شکر کی زیادتی نے ان کے چہرہ پر وہ علامتیں پیدا کر دی تھیں جو آخری سفر کی تیاری پر ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ آنکھوں میں پرخلوص پیار جھلک رہا تھا ہونٹوں پر کھل کھلاتی ہنسی بھی تھی لیکن ان کے قدم تھکے تھکے سے تھے جیسے کہہ رہی ہوں۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

اُن سے کئی کئی سال ملاقات نہیں ہوتی تھی لیکن ایک امید تھی کہ آج نہیں تو کل ملاقات ہو ہی جائے گی لیکن موت کے آگے سب مجبور ہیں۔ رضیہ آپا آنکھوں سے اوجھل گئیں لیکن ایسی ہستیاں پھولوں کی طرح ہوتی ہیں جو مرجھانے کے بعد بھی اپنی خوشبو سے دل و دماغ کو معطر اور ماحول کو مہکاتی رہتی ہیں۔ چنانچہ رضیہ آپا نے اپنی یادوں کے علاوہ "سیمن" "کانٹے" اور "اللہ دے بندہ لے" جیسے ناول اور کہانیاں چھوڑی ہیں کئی تراجم بھی ان کی یادگار ہیں جو انھوں نے مختلف زبانوں کی مشہور کتابوں سے اردو میں منتقل کئے ہیں۔ ان کی تحریروں کی زبان ہلکی پھلکی۔ رواں اور شائستہ ہے ترجموں پر بھی اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں چونکا دینے والی بات بہت کم ملیگی اس کے برعکس دھیمی دھیمی سلگتی چمکتی ایسی روشنی ملتی ہے جو انسان کے اندر کی

چھپی ہوئی انسانیت کو آہستہ آہستہ بیدار کرتی ہے۔

بہت کم نقادوں نے رضیہ سجاد ظہیر کے ادبی وجود کو وہ مرتبہ دیا جس کی وہ مستحق تھیں لیکن "نقوش زنداں" کی مخاطب رضیہ آپا کو بھلا اس کی فکر کیوں ہونے لگی کہ اوروں سے انھیں کیا ملا اور کیا نہیں بلا سے۔ یا وہ تو بس اتنا جانتی تھیں کہ جہاں تک ہو سکے دیئے جاؤ کہ دینے والا ہی سرفراز ہے بے شک رضیہ آپا کی یادیں صدا سرفراز رہیں گی۔

رضیہ آپا نے عمر کا وہ حصہ جس میں فراق کا تصور بھی جان لیوا بن جاتا ہے فراق و انتظار کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے گذارا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب فراق و انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ملن کا موسم آیا۔ لیکن وائے قسمت کہ سجاد ظہیر صاحب کی اچانک موت نے ان کو پھر وہیں لا کھڑا کیا جہاں سے وہ چلیں تھیں اور اب دائمی فراق کی گھڑیاں سامنے تھیں جس میں نہ انتظار کی کوئی گنجائش تھی اور نہ ہی امید کا سہارا۔ جب تک جیتی رہیں غم تنہائی ان کی مونس و غمگسار رہی یہ غم ان کے اپنے تھے اس میں انھوں نے کسی کی ساجھے داری لینی نہ کی اور پھر ۱۸ ڈیسمبر 1979ء کو دلی میں چپکے سے اپنے غموں کو سینے میں سمیٹے دنیا سے منہ موڑ لیا۔

سلیمان اریب

کس قدر پرانی بات ہے جب میں نے اریب صاحب کو دیکھا تھا۔ دُبلے پتلے دراز قد۔ لمبے سنہری بالوں کی لٹ پیشانی پر پڑی ہوئی۔ شیروانی میں ملبوس خالص دکنی شاعر معلوم ہوتے تھے۔ ابا نے ایک چھوٹی سی محفل شعر سجائی تھی۔ غالباً جگر صاحب کے اعزاز میں یہ اہتمام کیا گیا تھا اس محفل میں اریب صاحب نوجوان شعراء کی نمائندگی کر رہے تھے۔ عجیب اتفاق ہے آج جب میں یہ لکھ رہی ہوں تو اُس محفل کے تمام شاعر مرحوم ہو چکے ہیں۔ اور محفل شعر کا اہتمام کرنے والا بھی۔!

اس محفل کے بعد اریب صاحب سے ملنے جلنے کا سلسلہ قائم ہوا تو مرتے دم تک رہا۔ جب کبھی ابا حیدرآباد آتے یہ سب نوجوان شام ان کے گرد جمع ہو جاتے ایسے موقعوں پر اریب صاحب کی نظر ابا کے سگرٹوں پر رہتی رخصت ہونے لگتے تو سگرٹ چرانا کبھی نہ بھولتے۔!! یہ چوری ہم سب کے سامنے دیدہ دلیری کے ساتھ ہوتی قاضی صاحب بھی دیکھ کر نظریں چرا لیتے جیسے کہہ رہے ہوں "اٹھا لو زندگی کا لطف۔ یہ دن بار بار پلٹ کر نہ آئیں گے"۔!

اریب صاحب نے بڑی بے چین طبیعت پائی تھی۔ انشا پرداز بنتے بنتے شاعری پر اتر آئے اور شاعر بن گئے۔ جوش میں آئے تو "مجاہد تلنگانہ" لکھ ڈالی اور سکون سے دو سال جیل میں کاٹ دیئے۔ طبیعت کی بے قراری نے صحافت کے ریگستان میں لا پٹکا۔ کبھی جمہور کی صحافت کی تو کبھی "چراغ" کی ایڈیٹری سنبھالی۔ سب "اس" کے اداریے لکھے پھر اپنا ذاتی ماہنامہ "صبا" نکالا اور اسی کے ہو رہے۔ اب "صبا" ذریعہ معاش بھی تھا اور تسکین ذوق

کا ذریعہ بھی ۔ لیکن جہاں تک معاش کا تعلق تھا دیکھا گیا کہ کبھی ادیب "صبا" کو کھا رہے ہیں اور کبھی "صبا" انھیں کھا رہا ہے اس کشمکش میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خریدار کم ہو گئے اور اشاعت نہ ہونے کے برابر ہو گئی ۔ لیکن ادیب صاحب نے ہار نہیں مانی وہ صبا کی بقا کے لئے حالات سے جنگ کرتے ہی رہے ۔ "صبا" نے بہت جلد اپنا ایک مقام بنا لیا تھا باوجود پابندی سے شائع نہ ہونے کے اس کی ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں پڑا ۔ جہاں اپنے وقت کے مشہور لکھنے والوں کی تخلیقات "صبا" کے اعلیٰ معیار کی گواہی دیتی ہیں ۔ وہیں "صبا" نے نئے لکھنے والوں کو ادبی دنیا سے روشناس کرایا اور آج صبا کی بدولت کئی لکھنے والے ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کر چکے ہیں ۔ صبا کے ذریعہ ادیب صاحب نے اردو کے لکھنے والوں کیلئے جو کام کیا ہے وہ ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے ۔

ابا کے انتقال کے بعد بھی ادیب صاحب سے ادبی محفلوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں لیکن صفیہ سے شادی کے بعد ملاقاتیں دوستی میں بدل گئیں ۔ مخدوم صاحب کے تعزیتی جلسے میں ادیب صاحب سے ملاقات ہو گئی کینسر کے پہلے حملے سے کچھ دن پہلے جم گئے سنبھلے تھے ۔ گلے میں مفلر لپٹا ہوا تھا باتوں کا سلسلہ مخدوم صاحب سے شروع ہو کر ان کی صحت تک پہنچا اور پھر موت و زندگی کا فلسفہ چھڑا تو ادیب صاحب نے ایک بہت ہی عجیب واقعہ سنایا ۔ کہنے لگے "شاہد (صدیقی مرحوم) کا ایک صراحی اسٹینڈ بڑا پراسرار بنا ہوا ہے ہوا یوں کہ ایک مرتبہ میں (ادیب) مخدوم اور شاہد ایک سفر میں ساتھ تھے واپسی میں شاہد کا صراحی اسٹینڈ مخدوم کے پاس رہ گیا اور چند دن بعد شاہد کا انتقال ہو گیا وہ اسٹینڈ مخدوم کے پاس پڑا رہ گیا ہم لوگ بھول بھال گئے ۔ اتفاق دیکھو کہ ایک دفعہ پھر مخدوم کے ساتھ باہر جانے کا پروگرام بنا تو اس اسٹینڈ کا خیال آیا اس سفر میں وہ پھر ہمارے ساتھ ہو گیا ۔ واپسی میں وہ اسٹینڈ اتفاق سے میرے سامان کے ساتھ آ گیا ۔ اور چند دن بعد مخدوم بھی چل بسے ۔ اب صفیہ بہت گھبرائی ہوئی ہے اس کا خیال ہے کہ ضرور اس اسٹینڈ میں کوئی بات ہے پھر ہنس کر کہنے لگے ۔ میں نے طے کر لیا

ہے جس دن زندگی سے گھبرا جاؤں گا اس اسٹینڈ کو نکال کر یا ہر پھینک دوں گا میں نے کہا ادیب صاحب فضول باتیں مت کیجئے یوں ہی مخدوم صاحب نے ہلا کر رکھ دیا ہے خدا نہ کرے اب کوئی ایسی بات سننی پڑے!! اس وقت تو بات آئی گئی ہوئی لیکن ادیب صاحب کے جانے کے بعد کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کیا واقعی ادیب صاحب نے وہ صراحی اسٹینڈ پھینک دیا ہوگا؟ میں ایسی باتوں پر یقین تو نہیں رکھتی لیکن بعض حالات کچھ ایسے بن جاتے ہیں کہ ضعیف الاعتقادی کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔

ادیب صاحب تھے تو بہت باتونی لیکن انداز گفتگو اس قدر شگفتہ اور جاندار تھا کہ گھنٹوں سنا کیجئے۔ زندہ دل ایسے کہ قیامت بھی گزر جائے تو پیشانی پر بل نہ آتا۔ بھئی یقینی وہ بہت کھرے انسان تھے خوشامد اور چاپلوسی ان کے بس کی بات نہ تھی اور انسان ہونے کے ناتے یہ آنکی سب سے بڑی کمزوری تھی کوئی بات بری لگتی تو صاف صاف اظہار کر دیتے کھری کھری سنا کر دل ہلکا کر لیتے اور پھر یوں ملتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ تقریر ہو یا تحریر ان کی یہی صاف گوئی ان کے لئے وبال جان بن جاتی۔

کبھی کبھی خوشی پر آتے تو قہقہے کے صنم لنڈھا دیتے اور اکثر بے قابو ہو جاتے کچھ لوگ ان کی اس حرکت پر ناک بھوں چڑھاتے سچ پوچھئے تو برائی تو برائی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کسی رئیس کے دیوان خانے میں برائی اعلیٰ سوسائٹی کی علامت بن جاتی ہے اور کسی غریب کے جھونپڑے میں باعث ملامت ادیب صاحب پیارے انسان تھے۔ با اخلاق بامروت وضع دار اور دوستوں پر جان قدا کرنے والے۔ ایسی خوبیوں والا سوچ لیجئے کہ کیسا شوہر ہوگا اور کیسا باپ۔ ! میں جون میں دہلی سے واپس آئی تو معلوم ہوا ادیب صاحب پھر بیمار ہو گئے ہم دونوں مزاج پرسی کے لئے گئے تو وہ چند احباب کے ساتھ رمی کھیل رہے تھے ہم لوگوں کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں ساتھ لئے کمرے میں آ بیٹھے۔ کہنے لگے اب خیریت ہے میں نے بتایا کہ دہلی گئی ہوئی تھی عالم علی کی طرف اشارہ کر کے بولے آپ تو تھے!! لہجہ میں شکایت اور شکایت میں اس

بلا کی اپنائیت تھی کہ کچھ جواب دیتے بن نہ پڑا۔!

کافی دبلے ہوگئے تھے گردن میں ایسی اکڑ آگئی تھی کہ آزادی کے ساتھ جنبش نہ دے سکتے تھے بات کرنے میں بھی تکلف ہوتا تھا مسلسل بات کرتے رہے بیماری کا حال تو ایسے سنا رہے تھے جیسے کوئی لطیفہ بیان کر رہے ہوں۔ عالم علی کو اصرار کر کے سگرٹ پلایا کہنے لگے مجھے خواہش نہیں ہوتی لیکن دوسروں کو پیتے دیکھ کر خوشی بہت ہوتی ہے۔ صفیہ نے بتایا کہ ایک دن صفیہ کو سامنے بٹھا کر زبردستی بریانی کھلائی اور ایسا لطف اٹھا رہے تھے جیسے خود کھا رہے ہوں۔ غرض ہم لوگ کافی دیر ان کے ساتھ رہے چلنے لگے تو گیٹ تک آکر رخصت کیا اور پھر آنے کا وعدہ بھی لیا۔ چند دن بعد پتہ چلا کہ ادیب صاحب ہسپتال میں شریک کر دیئے گئے ہیں حالت نازک ہے ہم لوگ عیادت کے لئے نکلے تو یہ سوچ رہے تھے کہ نہ جانے کس حال میں دیکھیں۔ لیکن وہ ہم کو بیٹھے ہوئے ملے بند بند آواز سے ہی سہی خوب باتیں کیں دل نے کہا اس حالت میں بھی رہیں تو کیا برا ہے۔! لیکن اس کے بعد مسلسل ان کی حالت بدلتی اور بگڑتی رہی صفیہ جو خود ذیابیطس کی پرانی مریض ہے۔ دل اس بوجھ کو برداشت نہ کر سکا اور بگڑ گئی اس بار جب ہم ملنے گئے تو صورت حال بالکل مختلف تھی میاں بیوی پلنگوں پر پڑے تھے۔ ادیب صاحب کو مسلسل ہچکیوں نے ہلکان کر رکھا تھا۔ لیکن زبان پر کسی قسم کا گلہ شکوہ نہ تھا۔

صفیہ بتا رہی تھی کہ غذا پہونچانے کے لئے آپریشن کے ذریعہ پیٹ میں ٹیوب ڈالنے والے ہیں اس دن پہلی بار میں نے صفیہ کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھے۔ لیکن صفیہ ادیب کی زندگی سے مایوس نہیں تھی اس کو پورا یقین تھا کہ ٹیوب سے غذا پہونچنے کے بعد طاقت آجائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ آپریشن کے بعد ہم لوگ گئے تو صفیہ سکندرآباد ہسپتال میں منتقل ہو چکی تھی وہ پہلا موقعہ تھا کہ ادیب صاحب نے مسکرا کر ہاتھ کی جنبش سے سلام لیا بات نہ کر سکے۔ وہاں سے نکلے تو دلوں پر ایک بوجھ تھا ڈر اور اندیشہ تھا چار دن بعد ہی ادیب صاحب رخصت ہو گئے

ادیب صاحب اس سفر کی تیاری میں تقریباً دو سال سے لگے ہوئے تھے اس لئے ان کی موت اچانک نہ تھی لیکن بے وقت ضرور ہوئی۔ ان کے حوصلے جوان تھے کام کرنے کی لگن تھی انھوں نے اپنی بیماری کے بعد "صبا" کے ایک شمارے میں لکھا تھا "مجھے زندگی سے پیار ہے میں جینا چاہتا ہوں" ادیب صاحب عمر کی اس منزل پر تھے جہاں سے انسان ماضی کے تجربوں سے مستقبل کی راہیں ہموار کرتا ہے اور راستے ہموار ہو بھی چلے تھے گھر گرہستی لے کر بیٹھنے کے جو خواب صفیہ نے دیکھے تھے اب پورے ہونے کو تھے کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے خواب تو خواب حقیقت بھی ایک خواب بن کر رہ گئی۔

ہمارے ملک کا یہ دستور بھی عجیب ہے کہ فنکار جب تک زندہ رہتا ہے اس کو مرنے پر مجبور کرتے ہیں اور جب مر جاتا ہے تو اس کی موت کو ادب کا ایک عظیم سانحہ قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے ادیب صاحب کا خیال تھا کہ

میں نے کس دل سے شبِ غم کی سحر کی ہے ادیبؔ
یاد آئیگی زمانے کو میری بے جگری

کیا زمانے نے یاد رکھا؟

قاضی عبد الغفار صاحب نے پہلی مرتبہ حیدر آباد میں حیدر آباد کی اردو صحافت کے وقار و اعتبار کو اونچا کیا اور مستحکم بنایا انھیں کی مساعی کی بدولت اس شہر حیدر آباد میں پہلی مرتبہ انجمن صحافت اور انجمن مدیران جرائد قائم ہوئی۔ (جناب اختر حسن صاحب)

میرِ کارواں

جناب حبیب الرحمٰن صاحب

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ پہلی بار بابا (حبیب الرحمٰن صاحب) کو کب دیکھا تھا ہو سکتا ہے سن ۳۵-۱۹۳۴ء کی بات ہو۔ ہمارا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ بقول حالی بادشاہت کا زمانہ تھا۔ لاٹ صاحب بھی آجاتے تو پلٹ کر نہ دیکھتے کہ بھیا کون ہو۔!! ؟ پھر ابّا کے ملنے والوں کا دائرہ بھی اس قدر وسیع تھا کہ اگر کوشش بھی کرتی تو سب کو نہ پہچان پاتی۔ لیکن اب بڑا افسوس اور پچھتاوا ہوتا ہے کہ کیسی کیسی عظیم ہستیوں سے ملنے اور صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے کا موقعہ ملا مگر کچھ فیض حاصل نہ کیا۔

بابا سے ہمارا تعارف تو سُسرال آنے کے بعد ہی ہوا مگر بحیثیت قاضی صاحب کی لڑکی کے!! آپکو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ صحیح معنوں میں حیدر آباد آکر ہی قاضی صاحب کی بیٹی کو بھی قاضی سے متعارف ہونے کا موقع ملا اسی کو تو کہتے چراغ تلے اندھیرا ---!

حیدر آباد میں ابّا کے دوستوں اور مداحوں کی کمی نہ تھی۔ خاندانی روابط نبھانے کا رواج ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حیدر آباد میں کوئی اپنا نہ ہوتے ہوئے بھی ابّا کے چاہنے والوں کی وجہ سے احساسِ تنہائی کا گلہ کبھی نہیں ہوا۔ (جنہوں نے مجھے عزیزوں سے بڑھ کر چاہا اگر ان ناموں کو گنانے بیٹھ جاؤں تو ڈر ہے کہ اپنے موضوع سے بہت دور نکل جاؤں گی) جب حبیب الرحمٰن صاحب سے ملی ہوں تو وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور "انجمن ترقی اُردو" کے معتمد کی حیثیت سے جائزہ لے چکے تھے۔ اس واقعہ کا ذکر اپنی کتاب "یادداشتیں" میں اس طرح کرتے ہیں۔ "یہ سوال جوں کا توں تھا کہ کیسے وقت گذارا جائے۔ اسی ذہنی بے چینی کے زمانے میں پنڈت سندر لال جی اور قاضی عبدالغفار صاحب انجمن ترقی اُردو (ہند) کی نئی تنظیم کے تعلق سے دورہ کرتے

ہوئے حیدرآباد پہنچے اور یہاں کی شاخ کو دوبارہ متحرک کرنے کی غرض سے میرے مکان پر چند احباب کو مدعو کیا۔ اس اجتماع کے نتیجہ میں انجمنِ ترقی اُردو، شاخ حیدرآباد کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ اور اس طرح خود کو مصروف رکھنے کے لئے مجھے ایک کام مِل گیا۔ جو عین میری دلچسپی کے مطابق تھا۔" یہ تھی وجہ تسمیہ انکے انجمن سے وابستہ ہونے کی!

اُردو حبیب الرحمٰن صاحب کے لئے ذریعہ معاش کبھی نہیں رہی۔ اور نہ ہی اُردو اس سے پہلے کسی توجہ کی محتاج تھی۔ کیونکہ اُردو کے جانبازوں اور پرستاروں کی کمی نہ تھی۔ وہ تو حکمرانی کرتی تھی۔ لیکن وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بساط اُلٹ گئی۔ مُہرے تتر بتر ہو گئے اُردو بے سہارا ہو گئی اس وقت حبیب الرحمٰن صاحب ہی تھے جنھوں نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور اسکی بقا کا بیڑہ اُٹھایا۔ انہیں کا طفیل ہے کہ جب اُردو اور اُردو داں طبقہ ہدفِ ملامت بنایا جارہا تھا اُس وقت اُردو ہال کیلئے نہ صرف اپنی زمین کا عطیہ دیا بلکہ اُردو ہال تعمیر کرکے گویا ایک کارنامہ انجام دیا اور اسکے ٹرسٹ کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ اُردو کے تمام جلسے اسی ہال میں ہوا کرتے تھے۔ باہر سے آنے والی مشہور ہستیوں کا خیر مقدم بھی اسی ہال میں ہوا کرتا تھا۔ اُردو مجلس کے اجلاس تو آج بھی اُردو ہال میں منعقد ہوتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے حبیب الرحمٰن صاحب کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتی ہوں جو میری نظر سے گذرے ہیں۔ سنہ 63 یا 64ء کی بات ہے "اُردو کالج میگزین" کے لئے میں ان پر مضمون لکھنا چاہتی تھی کہ اگر انکے کان میں بھنک بھی پڑ گئی کہ میں کچھ لکھ رہی ہوں تو بڑی خبر لیں گے۔ مثلاً اگر انہیں کے بارے میں ان سے کچھ پوچھوں تو اُلٹا مجھ ہی سے پوچھا جائے گا "خیریت تو ہے مجھ پر جرح کیوں کی جارہی ہے۔"

اور اگر ڈرتے ڈرتے مدعا زبان پر ہی آجائے تو بڑی زور سے لاحول پڑھیں گے اور نہایت بے مروّتی سے فرمائیں گے۔ "کیا لغویت ہے! آپکو کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔؟" اس اچانک حملے سے اوسان خطا ہو جائیں گے اور لکھنا تو کجا جو مضمون سوچا تھا وہ بھی تھوڑی دیر کو دماغ سے نکل جائے گا۔ یہی سب سوچ کر اُن سے کچھ دریافت کرنے کی ہمت ہی نہ

ہوئی۔ معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہو سکا اور کچھ جو آنکھوں نے دیکھا تھا اسکی مدد سے مضمون لکھا گیا ہے۔

حبیب الرحمٰن صاحب پیدائشی حیدرآبادی ہیں، مدرسۂ آصفیہ۔ دارالعلوم اور نظام کالج کے بعد علیگڈھ سے ایم اے، ایل ایل بی کامیاب کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دن علیگڈھ میں معاشیات کے لکچرر رہے۔ دارالعلوم اور علیگڈھ کا ذکر بڑے چاؤ سے کرتے ہیں۔ دکنی ہوتے ہوئے بھی علیگڈھ کا رنگ کچھ اسقدر گہرا ہے کہ حیدرآبادی ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یوپی والے تو ان کو حیدرآبادی ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر بابا کو یل۔یل۔بی۔ پڑھنے کی کیوں سوجھی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جس کا اصول ہو انکا وکالت کرنا معلوم۔ لیکن اللہ کے بعد اللہ ہی جانے کسی اور کی وکالت کر سکے یا نہیں اُردو کی وکالت تو ڈنکے کی چوٹ کرتے رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے حیدرآباد میں اُردو نے اپنا مقام واپس لیا۔ اور آج جس طرح پھل پھول رہی ہے اسکی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ غرض علیگڈھ سے عثمانیہ یونیورسٹی آ گئے اور معاشیات کے پروفیسر مقرر کئے گئے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں انگلستان جا کر لندن اسکول آف اکنامکس سے B.S.c ڈگری لی۔ مختلف ماہرین معاشیات کے علاوہ پروفیسر لاسکی کے شاگرد بھی رہے جس کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

اسی زمانے میں اُردو میں معاشیات پر کتاب بھی لکھی۔ گو حبیب الرحمٰن صاحب اس کو از کار رفتہ کا نام دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اُردو سے پڑھنے والے اس کتاب کی مدد سے اپنی راہیں تلاش کرتے ہیں۔

تقریباً ۱۳ سال عثمانیہ یونیورسٹی میں کام کرنے کے بعد محکمۂ اطلاعات کے ناظم مقرر ہوئے۔ چند سال بعد ہی محکمۂ صنعت و حرفت نے انکی خدمات حاصل کر لیں۔ اسوقت نواب مہدی نواز جنگ معتمدی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انکے بعد حبیب الرحمٰن صاحب انکے جانشین ہوئے۔ ابھی ملازمت کے چار سال باقی تھے کہ سنہ ۱۹۴۹ء میں اپنی مرضی سے وظیفہ

پر سبکدوش ہو گئے۔

بابا جب کسی کام کی ذمہ داری لیتے ہیں تو احساس ذمہ داری دو چند ہو جاتا ہے۔ انجمن کی معتمدی کیا سنبھالی کہ اُردو کے ہو کر رہ گئے اور آخر کار اُردو کی بقاء کا ایک پہلو ۱۹۵۹ء میں اُردو کالج کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس اقدام سے نہ صرف اُردو کو بڑھاوا ملا بلکہ ان لوگوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھل گئے جو کسی مجبوری سے تعلیم جاری نہ رکھ سکتے تھے گویا ثواب جاریہ کی سبیل بھی پیدا ہو گئی۔ اُردو کالج کی پہلی کھیپ میں یہ ناچیز بھی شامل تھی۔ میں نے یہاں سے ڈپ اد، ال اور بی او ال کامیاب کیا تھا۔ کیسے معصوم دن تھے وہ۔ اساتذہ کی بے لوث خدمت کی اس سے بہتر مثال کیا ہو گی کہ بلا معاوضہ درس میں جٹے رہتے تھے۔ انکی سچی لگن طالب علم کی آتش شوق کو بھڑکاتی رہتی تھی۔ شعر و ادب سے وہ مہکتی شامیں ماضی کی خوشگوار اور ناقابل فراموش دور بن چکی ہیں۔ ابھی اُردو کالج کو قدم جمائے چند سال بھی نہیں ہونے تھے کہ محترم حسینی شاہد صاحب نے اردو آرٹس کالج کا شوشہ چھوڑا۔ کسی شاعر نے بڑے تجربے کی بات کہی ہے کہ "چھٹتی نہیں ہے منہ سے کافر لگی ہوئی" اردو کا نشہ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور یہ نشہ ہی تو تھا کہ باوجود مخالفتوں کے نہ صرف غیروں کی بلکہ اپنوں کی بھی۔ اپنوں کی مخالفتوں کا مقابلہ بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ اردو آرٹس کالج قائم ہو گیا۔

آرٹس کالج کے قیام کے سلسلے میں حسینی شاہد صاحب کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہو گی کیوں کہ وہ بابا کو سمجھنے سمجھانے میں اور ان کی پریشانیوں میں برابر کے شریک رہے کالج کے قیام میں حسن خوش دخروش کا شاہد بھائی نے اظہار کیا۔ وہ بلا مبالغہ حبیب الرحمن صاحب کے ارادوں کے لئے سہارا ثابت ہوئے اگر بابا پر یہ الزام ہے کہ وہ خشک مزاج ہیں تو یہ بہتان شاہد بھائی پر بھی لگایا جاسکتا ہے بس یوں سمجھئے کڑوا کریلا نیم چڑھا!

حبیب الرحمن صاحب کا وہ زمانہ آج بھی آنکھوں میں گھوما کرتا ہے جب ان کی عمر ۶۵ء

کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن ارادے ۔ حوصلے اور عزم کے اعتبار سے نوجوانوں کو بھی مات کر دیتے تھے ۔ ان کے جوش و ہمت کو دیکھ کر نوجوانوں میں کام کی امنگ پیدا ہوتی تھی ۔ بابا نکلے تو بیٹھ ہی نہ سکتے وقت کا ایک ایک لمحہ با مقصد اور کار آمد طریقے سے گذارتے ۔ یعنی محض انجمن اردو کالج مصروف رہنے کے لئے کافی نہ تھے اکہ دوست احباب کے اصرار پر کئی اداروں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ۔ علاالدین ٹکنیکل کالج اور ممتاز کالج کے تو وہ بانی ہی تھے ۔ آصفیہ ہائی اسکول جب کہ دم توڑ رہا تھا بابا اس کے لئے مسیحا ثابت ہوئے ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ غیر اردو داں حضرات کے لئے اردو کی کلاسیں چلائیں اور خود معلّم کے فرائض انجام دیئے ۔ امتحان لیکر ڈپلوما بھی دیتے تھے ۔

حبیب الرحمٰن صاحب جو گھر میں ہیں وہی باہر دفتر میں بھید بھاؤ کی گنجائش ہی نہیں ۔ بے حد اصولی انسان ہیں ۔ بعض خوبیاں اور عادتیں ایسی ہیں کہ عام طور پر مشکل ہی سے نظر آئے گی اور شاید انھیں خوبیوں کی وجہ سے ان کی شخصیت بڑی پر کشش ہو گئی ہے ۔ وہ بہت صاف ستھرے اور سادہ زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں ۔ تصنع اور نمائش سے شاید ہی کوئی اتنا گھبراتا ہو جتنا یہ پریشان ہو جاتے ہیں کبھی کبھی فائدہ بخش قسم کی نمائش بھی ان کے لئے اکتاہٹ کا باعث بن جاتی ہے ۔ جیسے ایک مرتبہ "اردو کالج" کی طرف سے یوم شبلی " منانا طے پایا ۔ استادوں اور طلباء کی خواہش تھی کہ یوم شاندار پیمانے پر منایا جائے ۔ چنانچہ دوسری تیاریوں کے علاوہ اردو ہال کی سجاوٹ پر بھی خاصی توجہ دی گئی ۔ ان علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کالج کی کچھ شہرت ہو ۔ غرض ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر ہم لوگ کام میں جٹے ہوئے تھے دو دن تک بابا بڑے صبر کے ساتھ اردو ہال کے بناؤ سنگھار پر بقول انھیں کے ہماری توانائیاں برباد ہوتے دیکھتے رہے آخر صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا ۔ ہال پر بڑی تنقیدی نظر دوڑائی اور بولے " کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ یوم شبلی منا رہے ہیں یا شبلی صاحب کا عرس ـ ! " اردو کالج کی امداد کے لئے جب بھی کسی تفریحی پروگرام کی تجویز ان کے سامنے رکھی گئی " اجی تو یہ کیجئے " کہکر ٹالتے رہے ۔

یا یا دور سے دیکھنے والوں میں خشک مزاج مشہور ہیں۔ کچھ دیر ان کی صحبت میں گذاریئے تو معلوم ہوگا کہ خوش مزاجی کا ایک آبشار رواں ہے۔ گھنٹوں اٹھنے کو جی نہ چاہے۔ حبیب الرحمٰن صاحب شفیق، بیرخلوص اور محبت بھرے دل کے مالک ہیں لیکن ان سے یہ توقع رکھنا کہ دیکھتے ہی آپ کو بانہوں میں لے لینگے یا کلیجے سے لگا لینگے بے سود ہے۔ ان کے خلوص و محبت کا آئینہ دار انکا رویہ اور سلوک ہوتا ہے۔

حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنی زندگی کے جو اصول بنا لئے ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ان کا خیال رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں میں اردو کالج میں تھی تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی اس وقت ان کے کام کرنے کا طریقہ اور رہن سہن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مثلاً ان کے پلنگ کے پائینتی ہمیشہ اخباروں اور فائلوں کا ڈھیر نظر آئے گا لیکن غور کریں تو اس میں بھی ایک ترتیب اور سلیقہ! ہر ادارے کے فائل کی جگہ مقرر کیا مجال کہ فائل کی جگہ بدل جائے یا اخبار کی ترتیب میں تاریخوں کا فرق آجائے۔

آپ خواہ کتنی ہی پابندی سے انجمن کا چندہ دیتے ہوں آپ کی پابندی وقت کے موصوف قائل بھی ہیں اور آپ کی ایمانداری پر کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن چونکہ انھوں نے یہ اصول بنا لیا ہے کہ چندہ وصول ہونے تک یاد دہانی کراتے رہیں اس لئے آپکے پاس اس وقت تک پوسٹ کارڈ آتا رہے گا جب تک چندہ ان کے ہاتھ میں نہ پہونچ جائے اور پھر اس ہاتھ سے چندہ لیں گے دوسرے ہاتھ سے رسید تھما دیں گے۔ یہی معاملہ حساب کتاب کا ہے۔ محض انجمن کا چندہ ہی نہیں بلکہ دوسرے تمام اداروں کا حساب کتاب گھر کے اخراجات و آمدنی کا حساب ایسا درست رکھتے ہیں کہ اگر آدھی رات کو بھی انکم ٹیکس والا دروازہ کھٹکھٹائے تو حساب دیکھکر گھڑوں پانی پڑجائے اور اپنا سا منہ لے کر لوٹ لے۔

وقت کی پابندی سب سے اہم اصول ہے۔ انجمن کے جلسے ہوں یا گھر کی کوئی محفل ایک منٹ تاخیر بھی

برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم دیکھتے تھے انجمن اور اردو مجلس کے موقعوں پر اگر مقررہ وقت کا لحاظ رکھتے تو پارہ کی طرح بے چین ہو جاتے کرسی پر مسلسل پہلو بدلتے رہتے کبھی بولنے والے پر کبھی ہاتھ کی گھڑی پر نظریں جاتیں۔ شیروانی کے دامن کی تو گویا شامت آجاتی ہر منٹ بے چینی میں دامن بدلتے کبھی دایاں بائیں پر اور کبھی بایاں دائیں پر اور چہرے پر ایسی بیزارگی اور بے چینی اور بے بسی کہ ہر شخص محسوس کرلے۔

وضعداری کا یہ عالم ہے کہ دوست نہ بھی رہے تو اس کے خاندان سے روابط قائم رکھتے۔ مجھے یاد ہے میں ڈیپ۔ ایڈ۔ ایل کا امتحان دے رہی تھی اردو ہال آکر امتحان کے لئے یونیورسٹی جانا پڑتا تھا۔ بابا نے ایک طریقہ بنالیا کہ میرے آتے ہی سلام دعا کے بعد کہتے "اوجلدی سے۔ چائے پی لو بالکل تیار ہے"

ابا کا انتقال ہو چکا تھا ظاہر ہے نہ مجھے شکایت کا موقع تھا نہ ہی ابا آگر گلہ کرتے کہ میری بیٹی سے چائے تک کو نہ پوچھا۔ یہ بابا کی وضعداری تھی ایسا کرنے کو اتنا دل چاہتا تھا۔ خالہ جان (بیگم حبیب الرحمن) کے ہاتھ سے بنے دہی پر ہمیشہ میری نیت خراب ہو جاتی تھی دن کے کسی حصے میں پہونچ جاؤں بیگم پاشا کو یاد دلاتے بھئی اس کو دہی تو کھلا دیجئے۔

بیگم پاشا ان کی رفیقۂ حیات تھیں زندگی کا طویل سفر ایک سچے رفیق کی طرح طے کیا سوچتی ہوں کہ ان کے بنا بابا کو کیسا لگتا ہوگا۔ بیوی کی جدائی کا دکھ ابھی تازہ ہی تھا کہ بیٹے کی موت کی خبر سننا پڑی۔ تقریباً چار سال سے کراچی میں بیٹی کے ساتھ ہیں۔ حبیب الرحمن صاحب حیدرآباد سے باہر جانے کے تصور سے بھی گھبرا جاتے تھے اور اب ایسا وقت آیا کہ حالات نے وطن ہی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ کتنا مجبور ہے انسان۔!

تاثراتِ سفر

انسان کا پہلا سفر تو تھا حضرتِ آدم کا معہ بی بی حوا کے از جنت الفردوس تا کرۂ ارض! اور آخری سفر جس کو سفر آخرت کا نام دیا جاتا ہے تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن کب، کہاں اور کس وقت یہ سفر در پیش آجائے اس کی اللہ میاں نے بھنک تک نہ دی۔ البتہ پہلے اور آخری سفر کے درمیانی وقفہ میں پوری آزادی دے دی کہ "اے میرے بندو گھومو پھرو دکھاؤ، بیو، دلکش مناظر کا لطف اٹھاؤ اور قدرت کا تماشا دیکھو اگر عقل رکھتے ہو تو جستجو بھی کرو اور عبرت بھی حاصل کرو۔

تو جناب عالی ہم نے اللہ کے فرمان کو سر آنکھوں پر لیا اور یہ کہتے ہوئے نکل پڑے سفر پر کہ

"سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں؟

اپنے ملک کی تو خوب سیر کی تھی لیکن ملک سے باہر پہلا سفر کینیڈا کا تھا کہ وہاں ہمارا نواسہ پیدا ہونے والا تھا۔ جی ہاں آج کل نانی پوتے دیارِ غیر میں پیدا ہوتے ہیں۔ بجائے بیٹیاں ماں باپ کے پاس کے آنے کے ماں باپ انکے پاس جاتے ہیں اسی کو کہتے ہیں رام تیری الٹی گنگا!

یہ سفر اس لئے بھی اہم تھا اتنا لمبا سفر ہم تنہا طے کر رہے تھے اور خاندان والے دانتوں میں انگلی کہ دبائے ہماری ہمت پر عش عش کر رہے تھے۔ غرض سب کو انگشت بدنداں چھوڑ ۸ جنوری ۱۹۷۶ء کی درمیانی شب بمبئی سے بذریعہ ایر انڈیا اڑے تو لندن جا کر دم لیا۔ یہاں چند گھنٹے ہوائی جہاز ٹھہرا کیونکہ اندر صفائی اور باہر پٹرول کی بھرائی کا کام ہوتا تھا کافی مسافر پیٹھ سیدھی کرنے اور پیروں کو قابل استعمال رکھنے کے لئے اترے۔ ظاہر ہے خریداری کی نیت بھی باندھی ہو گی۔ ہم نے دور اندیشی سے کام لیا اور اپنی جگہ ڈٹے رہے ہمیں اپنے اغواء کا خدشہ تو نہیں تھا کیوں کہ نانی بنے جا رہے تھے البتہ اپنی گمشدگی کا اندیشہ ضرور لگا تھا ابھی تک حیدر آباد کی سڑکوں سے پوری طرح مانوس نہیں ہوئے تو لندن کے ایرپورٹ پر جس کے متعلق سن رکھا تھا کہ جہاز میں سوار ہونے کے کئی راستے ہیں اور ایک

وقت میں کئی ہوائی جہاز تیار کھڑے رہتے ہیں ایسی صورت میں ہمارے لاپتہ ہونے کے کافی روشن امکانات تھے بھلا بتلائیے ہم نے سمجھداری سے کام لیا کہ نہیں ؟ یوں جہاز کے اندر کی بھی دلچسپیاں کچھ کم نہ تھیں جہاز کی صفائی کرنیوالی لڑکیاں ۔ ہائے ! کیا پیاری بھولی بھالی صورتیں اور اس پر قسمت کی ستم ظریفی یہ کہ ہاتھ میں جھاڑو ۔ کچھ کچھ شبہ ہوتا ہے کہ دور غلامی میں کون جانتے کالا صاحب لوگ انھیں کو پکڑ لے جاتے ہوں کیوں کہ ہم نے اپنے ابا سے سنا تھا کہ اٹھارہ سال یا شاید اکیس سال کی عمر ہونے تک ولایت کے اچھے خاندانوں کی لڑکیاں کسی محفل میں شریک نہیں ہوتیں اور بغیر نگراں کے گھر سے باہر نہیں نکلتی تو بھلا ہمارے صاحب لوگ کی وہاں تک پہونچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لے دے کر بات جھاڑو والی تک ہی پہونچتی ہوگی ۔

جھاڑو والیوں کی صورتوں کو آنکھوں میں بسائے لندن سے روانہ ہوئے تو نیویارک پہونچے یہاں جہاز بدلنا تھا ۔ ایر کینڈا کے جہاز میں بیٹھ کر جانب کینڈا پرواز کر گئے چند گھنٹوں میں ٹورنٹو پہونچے ایک رات وہاں گزار کر دوسرے دن VINNIPES کے ایرپورٹ پر جا اترے جہاں اپنے بیٹے کو منتظر پایا ۔ کلیجے سے لگایا بلائیں لیں اور کار کے ذریعہ دو گھنٹے میں منزل مقصود برانڈن BRANDAN پہونچ گئے ۔ لندن سے یہاں تک کیا گذری اس پر پردہ پڑا رہے تو ہی بہتر ہے ورنہ ہمارے تاثرات سننے سے پہلے ایسا نہ ہو کہ ہماری حماقتوں کی روداد سن کر ہماری طرف سے آپ کے تاثرات متاثر ہو جائیں قصہ مختصر ! کہ اس طرح ہم نے لگے ہاتھوں کینڈا کے تین سفر کر ڈالے ۔

کینڈا دنیا کے بڑے ملکوں میں دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے آبادی ' رقبہ کے اعتبار سے بہت کم ہے یعنی دو کروڑ بیس لاکھ ! خوشحال کھاتا پیتا ملک ہے ۔ معدنیات کے خزانوں سے ' قدرت نے دل کھول کر نوازا ہے کئی موسم ہوتے ہیں ہر موسم اپنا ایک الگ کردار اور منفرد حسن رکھتا ہے ۔ قدرتی مناظر کی بہتات ہے ۔ نیاگرا آبشار کی کشش تمام دنیا کے سیاحوں کو اپنے اطراف جمع رکھتی ہے لیکن جہاں تک تہذیب و تمدن کا تعلق ہے وہ یہاں نا پید ہے اس ملک کو عالم وجود میں آئے شاید ایک صدی بھی نہیں گذری اسی لئے یہاں آثار قدیمہ قسم کی کوئی چیز ہی نہیں پائی جاتی بلکہ اس قدر یکسانیت

ہے کہ ایک بار ملک گھوم لینے کے بعد دوبارہ جانیکی خواہش نہیں ہوتی مثلاً ایک مکان اور ایک دُکان اگر آپ نے دیکھ لیا تو سمجھ لیجئے کہ جہاں بھی آپ جائیں گی یہی نمونے نظر آئیں گے حتیٰ کہ گھروں کی سجاوٹ اور دُکانوں میں رکھا سامان تک یہی یکسانیت وہاں کے لوگوں میں بھی ہے وضع قطع طور طریقہ سب ہی ایک جیسے ہیں۔

یوں تو اچھائی برائی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ اچھے برے ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن کچھ برائیاں جو وہاں ہنر کی طرح برتی جاتی ہیں جب اپنے ہندوستانیوں کو اس میں ملوث دیکھتی ہوں تو بہت تکلیف ہوتی ہے میں وہاں کے رہن سہن سے بہت متاثر ہوئی۔ کئی حیرتناک اور عبرتناک انکشافات ہوئے اور چونکا دینے والے واقعات بھی پیش آئے۔ کچھ باتیں دل میں گھر کر گئیں تو کچھ نے بد دلی اور بیزاری کا احساس دلایا۔ اصل میں نیا ملک ہونے کی وجہ سے ان کی اپنی کوئی تہذیب نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی تمدن یا اعلیٰ قدریں ان کے حصہ میں آئی ہیں اور اگر ان کے ساتھ اعلیٰ روایات آئی بھی ہوں گی تو مشینی زندگی میں الجھ کر وہ اس کی حفاظت نہ کر سکے سچ پوچھئے تو وہاں کی دنیا ہی نرالی ہے ہماری دنیا سے بالکل مختلف ہمارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑی خوبیوں کا ملک ہے بیحد صاف ستھرا۔ لوگ ہنس مکھ وقت پر کام آنیوالے۔ تجارت ہو یا سرکاری ملازمت ایمانداری اور دیانتداری سے انجام دیتے ہیں۔ وقت کے پابند وعدے کے پکے اور زبان کے سچے قابل بھروسہ ہوتے ہیں اور آپ سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہونچائیں گے۔ ناپ تول زیادہ ہو سکتا ہے بلکہ اکثر میں نے ایک گز کپڑا لیا تو ہرا گز نکلا کسی دُکان سے خریدی ہوئی چیز اگر آپ ایک مہینے کے بعد بھی واپس کرنا چاہیں تو دُکاندار خوش دلی کیساتھ لے کر قیمت واپس کر دیتے ہیں ایسا بھی میرے ساتھ کئی بار ہوا۔

عام زندگی میں کام کی قدر کی جاتی ہے کام کرنے سے غرض کام کی نوعیت کیا ہے اسکی پرواہ نہیں کرتے حقیر سے حقیر کام کرنے میں کوئی بھی شرم محسوس نہیں کرتے اسی لئے آپس کے تعلقات میں عہدے یا تنخواہیں حائل نہیں ہوتیں۔ ہوٹل میں جھاڑو دینے والا مالک کیساتھ بے تکلفی سے بیٹھ کر کافی پیتا ہے اور

نے بھی عورت کو مرد کے برابر کا درجہ دیا ہے بلکہ کہیں کہیں عورت کے حقوق مرد سے زیادہ ہی ہیں
گھر کے کاموں میں بھی مرد کو بیوی کا ہاتھ بٹانا پڑتا ہے جب ان کے یہاں پہلا بچہ آنیوالا ہوتا ہے
تو ماں کے ساتھ ساتھ ہونے والے باپ کو بھی بچے کی پرورش کے پورے گر سکھائے جاتے ہیں ہم
نے اکثر بازاروں میں دیکھا کہ بچے کو سنبھالنے کا سلیقہ باپ میں زیادہ ہے۔

کنیڈین بڑے زندہ دل اور شوقین مزاج ہوتے ہیں۔ غرض یہ لوگ بھرپور زندگی گذارنا خوب
جانتے ہیں باوجود ان تمام خوبیوں کے اور جبکہ معاشی طور پر مطمئن ہونے کے ازدواجی زندگی میں بڑا جھول
نظر آتا ہے ہر روز گھر اجڑتے ہیں اور بچے برباد ہوتے ہیں جھگڑے اور لڑائیاں جو ہاتھا پائی تک
پہونچ جاتی ہیں روز کا معمول ہیں۔ اخبارات ایسے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں بن بیاہی ماؤں
کی بھی کمی نہیں ان لڑکیوں کی عمریں مشکل سے ۱۴ یا ۱۵ سال ہوتی ہوں گی ایسی مائیں اکثر بچے کو
ہسپتال میں ہی چھوڑ کر چلی جاتی ہیں کبھی تو بے چارے یتیم خانوں میں پلتے ہیں اگر قسمت اچھی ہو تو
کوئی لاولد گود لے لیتا ہے

میرا خیال ہے اعلیٰ اقدار اور مذہبی روایات جو بزرگوں سے ورثے میں ملتی ہیں اور زندگی کی راہیں
متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں ان کا یہاں فقدان ہے عریانیت اور بے حیائی انکی تہذیب
ہے جس طرح جذبات کی رو میں بہہ کر چھوٹی چھوٹی عمروں میں شادیاں کرتے ہیں اسی طرح چند برسوں میں اپنے
ہاتھوں ختم بھی کر دیتے ہیں۔ نجی معاملات میں یہ لوگ کسی کا دخل پسند نہیں کرتے بزرگوں کے تجربے سے فائدہ اٹھانا
یا اہم قدم اٹھانے سے پہلے ان سے مشورہ کرنا کسر شان سمجھتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ اپنی عقل کے بل بوتے پر الٹے
سیدھے فیصلہ کر لیتے ہیں یہ ترقی یافتہ ملک تو ضرور ہے لیکن نہ جانے انکو CIVILISED COUNTRY
یعنی تہذیب یافتہ ملک کیوں کہا جاتا ہے ان کے ذہنوں میں تہذیب کا جو بھی تصور ہو کم از کم ہماری سمجھ
سے بالاتر ہے دیکھئے وقت کس طرح پر لگا کر اڑ گیا اور ابھی تو بہت کچھ کہنے کو باقی رہ گیا خاص کر بچوں
اور ہندوستانی خاندانوں کا طرزِ زندگی وغیرہ۔ خیر پھر سہی۔

یاد زندہ صحبت باقی

شہر حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں
خواتین کا حصّہ

خواتین میں تعلیمی ترقی اور بیداری کا ابتدائی کام مردوں ہی کو کرنا پڑا ہے کیونکہ انیسویں صدی کے نصف آخر تک ہمارے سماج کے ایسے بندھے ٹکے اصول تھے کہ عورت کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ اپنی تعلیمی بیداری کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھائیگی ناممکن سی بات تھی۔ جنگ آزادی اور غدر کی افراتفری کے بعد سماج کی چولیں ہل گئیں اور مختلف طبقوں میں ایک ایسا انتشار پیدا ہوا کہ اُس نے سنجیدہ ذہنوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مصلحین اور مفکرین نے دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ عورت کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کی طرف بھی توجہ دی۔ اگر ہم ہندوستان کے اُس دور کی تمام زبانوں کا ادب پڑھیں تو اکثر و بیشتر زبانوں میں چند موضوعات مشترک نظر آئینگے جن میں عورت کی تعلیم اور سماجی حیثیت کا موضوع نمایاں نظر آتا ہے دور کیوں جائیے۔ سرسیّد، نذیر احمد، حالی اور شبلی کے ساتھ ساتھ اگر تلگو کے "ویریشلنگم"، کو بھی پڑھیں تو محسوس ہوگا کہ اُس زمانے کے حساس دل اور بیدار دماغ ایک ہی جیسے خطوط پر سوچ اور لکھ رہے تھے۔

ایسی بات نہیں تھی کہ جنگِ آزادی سے پہلے تعلیم نسواں کا رواج ہی نہ رہا ہو تاہم یہ ایک خاص طبقے تک محدود تھی، امراء اور خوشحال گھرانے اپنی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیتے تھے۔ ان خواتین نے ادب کی دنیا میں نام بھی پایا ورنہ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم اور شہزادی زیب النساء تاریخِ ادب میں جگہ نہ پاتیں جنکے ادبی شہ پارے آج بھی توقیر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن اس مقام تک پہونچنا صرف شاہزادیوں اور رؤسا تک ہی محدود تھا۔ نچلے متوسط طبقے کا ذکر ہی کیا۔ خود متوسط طبقے کے شرفاء میں بھی لڑکیوں کو حرف

بزرگ، پڑھنا تو سکھا دیتے تھے لیکن عورت کے ہاتھ میں قلم برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

جب سر سیّد کے عہد میں ایک عام بیداری کی لہر آئی اور اصلاح حال کا شعور بھی جاگا تو لڑکیوں کے مستقبل کی اہمیت کھل کر سامنے آئی اور کچھ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی کتابوں "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" میں لڑکیوں کیلئے ایک ایسے مکتب کا نمونہ پیش کیا ہے۔ جس میں جہاں امیرزادی، حسن آرا اور شریف زادی، محمودہ یکجا ہیں تو وہیں کنجڑوں اور قلعئی گروں کی لڑکیاں بھی پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں گویا نذیر احمد نے ایک جمہوری نظام تعلیم پیش کر کے ہر طبقے اور حیثیت کی لڑکوں کی تعلیم کی۔ ضرورت پر زور دیا ہے۔

مولانا حالی نے اپنی نظموں میں عورت کی حالت زار پر روشنی ڈالی ہے اور "مجالس النساء" میں انکی تعلیم کا مطالبہ کیا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس کتاب کا مقصد ہی تعلیم نسواں ہے۔ ذرا تو غور تو کیجئے ایک ایسے ماحول میں جبکہ عورت اپنے وجود کو بھی شک کی نظر سے دیکھتی تھی ایک روشن خیال عالم دین عورت کے حق کی بات کرتا دکھائی دیتا ہے حالانکہ مولانا شبلی تھے تو مذہب اور تاریخ کے عالم لیکن اُنہوں نے نئی اور باقاعدہ تعلیم کو ناگزیر بتایا ہے یہانتک کہ مردوں اور عورتوں کے لئے ایک ہی نصاب تعلیم کی سفارش کی ہے تاکہ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی کی راہیں ہموار ہو سکیں۔

ان مصلحین کی کوششیں رنگ لاکر رہیں۔ رفتہ رفتہ جگہ جگہ چراغ سے چراغ جل اُٹھے۔ بڑے شہروں میں تعلیم نسواں کے چرچے ہوئے تو چھوٹے شہروں، ضلعوں اور قصبوں تک کرنیں پہونچیں۔ ایسے میں ہمارے نسوانی رسائل اور روشن دماغ ادیبوں نے تعلیم نسواں کو عام کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ان رسائل میں تہذیب نسواں، عصمت اور بنات سر فہرست نظر آتے ہیں۔ یوں تو ان پرچوں کی فہرست طویل ہوتی گئی۔ اگر چہ کہ اکثر پرچے تہذیب اور عصمت کی طرح اشاعت کی پابندی نہ کر سکے۔ جیسے "نساء" جو بعد میں "زیب النساء" کے نام

سے شائع ہوتا تھا جس کی ادارت میں محترمہ صغرا ہمایوں صاحبہ نام آتا ہے۔ اسکے علاوہ خاتونِ مشرق، حور، سہیلی، اور "شعاعِ اُردو" وغیرہ ان رسائل نے یا د خود اپنی مختصر عمر کے خواتین کے شعور کو بیدا کرنے میں جو رول ادا کیا ہے اسکے لئے ہمکو انکا ممنون ہونا چاہیئے۔

حیدر آباد بھی دیسی ریاست رہی ہے یہاں بھی شمالی ہند کی طرح ایک عرصے تک غدر سے پہلے والی کیفیت موجود تھی اور تعلیم صرف شہزادیوں اور صاحبزادیوں کی میراث سمجھی جاتی رہی ہے۔ متوسط طبقے میں تعلیمِ نسواں کے نام پر تھوڑی بہت دینی تعلیم کو ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ جہاں تنگ مردوں کی بالادستی نے عورت کو جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکنے پر مجبور کیا وہیں ایسی حساس دل اور روشن خیال ہستیاں بھی پیدا ہوئیں جنہوں نے عورت کے حق کیلئے آواز اٹھائی اور علم کی برکتوں سے فیضیاب ہونے کی راہیں سجھائیں۔ ان ہستیوں میں ایک مولوی محب حسین صاحب بھی تھے۔ حیدر آباد میں محب حسین صاحب وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے عورت کے مسائل اور علم سے اسکی محرومی کو شدت سے محسوس کیا اور تقریر و تحریر کے ذریعہ لوگوں کو متوجہ کیا۔ انہوں نے حقوق کی وکالت ہی نہیں کی بلکہ ایک ماہنامہ "معلم النساء" کے ذریعہ آزادیٔ نسواں کا پرچار بھی کیا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ شخصی حکومتوں میں آزادی کی باتوں کی گنجائش نہیں ہوا کرتی اور وہ بھی عورت کی آزادی کی بات!!

مولوی صاحب کو اپنی آزاد خیالی کیلئے قدم قدم پر مخالفتوں سے دو چار ہونا پڑا اور آخر کار بحکم سرکار "معلمِ نسواں" کی اشاعت روک دی گئی لیکن وہ اپنے مقصد کو لیکر آگے بڑھتے رہے۔ بہت سوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی آواز پر لبیک کہنے والوں میں نواب ممتاز یار الدولہ اور خورشید علی صاحب کے نام ملتے ہیں۔ ان اصحاب نے محب حسین صاحب کے مشن کو چلانے میں ہر طرح اُنکی مدد کی جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا چنانچہ سلطنتِ آصفیہ کے سرکاری نسوانی

مدارس سے قبل ہی باہمت خواتین نے سماجی اصلاحی کام کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کو عام کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اگر ہم صرف تعلیمی میدان تک ہی محدود رہیں تو ہمیں کئی نام مل جائینگے جیسے خاندان سالار جنگ کی صاحبزادی نور النساء بیگم، بیگم خدیو جنگ اور انکی دونوں صاحبزادیاں معصومہ بیگم اور مرحومہ سکینہ، صغرا ہمایوں مرزا، بیگم امیر حسن لیڈی حیدری، رقیہ بیگم احمد حسین مدنی، انکی دختران سارا بیگم مرحومہ اور رابعہ بیگم وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے کچھ اپنے حلقوں میں خاموشی کے ساتھ علم کی دولت لٹاتی رہیں۔ اور کچھ کے کارناموں سے لوگ واقف ہوئے جنکی یادگاریں آج بھی نامساعد حالات کے باوجود ثابت قدمی کے ساتھ کام میں جٹی ہوئی ہیں جیسے مدرسۂ منہاج الشرقیہ، معظم جاہی مارکٹ ہائی اسکول، مدرسۂ صفدریہ تربیت گاہ اور سعید المدارس وغیرہ۔

تعلیم و تربیت لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک پاکیزہ معاشرہ کی تشکیل میں گویا تانے بانے کا کام کرتے ہیں۔ دونوں سے ایک بھی ناقص رہ جائے تو جھول پیدا ہو جاتا ہے اور خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا اس لئے ہماری ان بزرگ خواتین نے بھی علم کی روشنی گھر گھر پہونچانے کے لئے سماجی کمزوریوں کے تدارک اور اصلاح معاشرے کو اولیت دی تھی۔ اس طرح اس کام کیلئے کئی انجمنیں وجود میں آئیں۔ اور انھیں کے تحت چند تعلیمی ادارے آج بھی کام کر رہے ہیں۔ جن میں انجمن خواتین اسلام جسکی بانی بیگم طیبہ خدیو جنگ تھیں اور صغرا ہمایوں مرزا معتمدی کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ اس انجمن کے تحت بھی ایک مدرسہ اس وقت بھی چل رہا ہے۔ محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ باوجود ضعیف العمری کے اسکی بقا کے لئے جدوجہد میں لگی رہتی ہیں۔

بیگم طیبہ خدیو جنگ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کی صاحبزادی تھیں۔ سید حسین بلگرامی علمی خدمات اور تدبر و فراست کیلئے آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ یہ اوصاف طیبہ بیگم کو ورثہ میں ملے تھے۔ انکی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ مدراس سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ یہ حیدرآباد کی پہلی

مسلم خاتون تھیں جنکو یہ اعزاز ملا۔ عربی فارسی اور اُردو کے علاوہ انگریزی میں بھی دستگاہ حاصل کی۔ جہاں بہت اچھی انشاء پرداز مقرّر، افسانہ نگار اور شاعرہ کی حیثیت سے جانی پہچانی گئیں وہیں سماجی خدمات میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ انجمن خواتین دکن بیگم صغرا ہمایوں مرزا صاحب کی بنا کردہ ہے جسکے طفیل میں آج ہم سب جمع ہیں۔ اسکے علاوہ انجمن ترقی تعلیم و تمدنِ نسواں تھی جس میں بلا لحاظ مذہب و ملّت بڑے پیمانے پر کام ہوتا تھا۔ ویمنس کانفرنس کا سہرا اسی کے سر جاتا ہے۔ اس انجمن کی نگرانی میں تین مدارس اور ایک دارالاقامہ قائم کیا گیا تھا۔

• صدر مجلس خواتینِ دکن کی جانب سے معظّم جاہی مارکٹ ہائی اسکول اور تربیت گاہ زور و شور سے کام کر رہا ہے۔

ان انجمنوں کی بانی اور اراکین اپنے زمانے کی نوجوان تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین تھیں خوش نصیبی سے انکے گھر کے مرد اعلیٰ قدروں کے حامل دور اندیش اور دوربین افراد تھے جن کا بھرپور تعاون ان مستورات کو حاصل تھا۔ ان خواتین کا آپسی اتحاد ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ انجمنیں تو بے شک اپنے اپنے نام سے جانی جاتی تھیں لیکن اراکین کسی نہ کسی حیثیت میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے جب اپنے مضمون کیلئے مواد تلاش کرنے کی کوشش کی تو یقین جانیئے ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ناممکن نظر آیا۔ تعلیمی ترقی میں خواتین کے نام اور کام اتنے زیادہ ہیں کہ مختصر سے مضمون میں انکا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ بڑا دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ آج کے نوجوانوں میں ایثار کا جذبہ مفقود ہے، مِل کر کام کرنے کا تصوّر باقی نہیں رہا اب تو جسے دیکھئے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد تعلیم نسواں کا کام قدرے آسان ہو گیا اور اعلیٰ تعلیم اور ڈگری یافتہ خواتین کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ آج تک کی تعلیم یافتہ خواتین کا تذکرہ طوالت کا باعث ہوگا اس لئے صرف ریاست حیدرآباد کے دور کی چند بیگمات کے نام پر اکتفا کروں گی

جنہوں نے درس و تدریس کے پیشے کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھا۔ ان میں ڈاکٹر آمنہ پوپ، بیگم رقیہ زرین یار جنگ، نوشابہ خاتون، مس میری تندی، محمدی بیگم، لیلامنی نائیڈو، نورالنساء بیگم مسز اکرم، غیرالنساء بیگم، فخرالنساء بیگم جنکی فارسی دانی کا سکہ چلتا تھا، سلامت النساء بیگم، تصدق فاطمہ اور جہاں بانو نقوی آج کی کئی صاحبِ قلم خواتین جہاں بانو نقوی کی شاگردوں میں شامل ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ کی صد سالہ تقاریب کے موقعہ پر کچھ کہنے کا موقعہ ملا۔ قابلِ مبارکباد ہیں وہ لوگ جو اپنے محسنوں کو یاد رکھتے ہیں اور انکے کارہائے نمایاں کو آج کی دنیا سے روشناس کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جناب نصیرالدین ہاشمی صاحب مرحوم کے ہم احسان مند ہیں کہ انھوں نے ریاست کی ان تمام خواتین کے تعلیمی، سماجی اور اصلاحی کارناموں کو بڑی جانفشانی اور تحقیق کیساتھ کتابوں میں محفوظ کر دیا اور بے شمار مضامین لکھ کر مختلف رسائل کے ذریعہ خواتین کو متعارف کرایا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مضامین بھی کتابی شکل میں یکجا کر دیئے جائیں۔

محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کا نام حیدرآباد کی ان خواتین میں سرِفہرست ملتا ہے جنہوں نے تعلیمی ترقی میں جی جان سے حصہ لیا۔ تعلیمی میدان ہو یا اصلاحِ معاشرے کا منصوبہ بنانا صغرا بیگم کا نامِ گرامی ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے علم و ادب کی یکساں خدمت کی ہے۔ مدرسہ صفدریہ تعلیمی کارناموں میں انکی زندہ یادگار ہے۔ اس مایہ ناز خاتون کی صد سالہ تقریب کے موقع پہ نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ انکے طریقۂ کار کو نئی نسل تک پہونچانا ہے۔

حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر جناب صفدر علی مرزا کے گھر ۱۸۸۴ء میں صغراء بیگم نے جنم لیا۔ تعلیم دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ پٹنہ کے ایک نامور خاندان کے ہونہار تعلیمیافتہ نوجوان ہمایوں مرزا سے ۱۹۰۱ء میں بیاہی گئیں۔ شوقِ کتب بینی نے علمی قابلیت کو جلا بخشی۔ خداداد صلاحیتوں میں نکھار اور اظہار کا سلیقہ آیا۔ انکی بے شمار نثری اور شعری تخلیقات

بطور گواہ موجود ہیں ۔ اسکے علاوہ رسالہ "النساء" جاری کر کے صحافت کی دنیا میں جگہ بنائی ۔

محترمہ صغرا ہمایوں مرزا مرحومہ کے اصلاحی کاموں کی ابتداء ۱۹۰۲ء سے ہوتی ہے جبکہ لیڈی واکر نے زنانہ سوشیل اسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی تھی۔ صغرا بیگم کا بھرپور تعاون حاصل تھا ۔ مدرسۂ صنعت و حرفت آپکا سب سے نمایاں کارنامہ ہے ۔ اسکی عمارت کی تعمیر کیلئے ایک معقول سرمایہ وقف کر کے فراخدلی کی مثال قائم کی۔ انکے کاموں کے اصل روح رواں جسٹس ہمایوں مرزا ہی تھے جنہوں نے بیوی کا ہر طرح ہاتھ بٹایا۔ شوہر کی رفاقت میں اصلاحی اور سماجی کاموں کا آغاز کیا۔ لڑکیوں کے لئے صفدریہ ہائی اسکول کے علاوہ بیت المعذورین انیس الغرباء کی سرپرستی فرمائی اور انجمن خواتین دکن کا قیام عمل میں آیا ۔

ایک ایسے دور میں جبکہ روایت پرستی اور قدامت پرستی شدت کے ساتھ جاری و ساری تھی ۔ رسمی پردے کے خلاف آواز اُٹھانا بلاشبہ صغرا بیگم کا جراٗت مندانہ اقدام تھا۔ شدید مخالفتوں کا مقابلہ جس بے جگری سے انہوں نے کیا اور خواتین میں ذہنی انقلاب پیدا کیا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ صغرا ہمایوں مرزا وہ پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے مردوں کے جلسوں میں خطابت سے ہلچل پیدا کی ۔ اور یہ واضح کر دیا کہ عورت علم و دانش میں کسی سے کم نہیں ہے۔ ۷۸ سال کی عمر میں ۱۹۵۸ء میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئیں ۔ لیکن ان کا نام انکے کاموں سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

تعلیم نسواں اور آزادئ نسواں کا جو نعرہ اور مطالبہ اسوقت کی دور اندیش خواتین نے دیا تھا آج اسکے اثرات صاف نظر آرہے ہیں لیکن اگر خواتین کی تعلیم کا تناسب دیکھا جائے تو اب بھی آٹے میں نمک کے برابر ہے، آخر ایسا کیوں ؟

کیا ہی اچھا ہو کہ ایسی خواتین متواتر جنم لیتی رہیں تا کہ عورتوں کی علم و آگہی کا دھارا مسلسل بہتا رہے اور انسانیت کی کھیتی سیراب ہوتی رہے ۔ ✶ ✶

رکشا والا

وہ ایک گھنٹہ قبل ہی دروازے پر آن موجود ہوا۔ آج اس کا پہلا دن تھا۔ یوں تو ہمیشہ میں اسکول پیدل ہی جاتی تھی مگر کالج میں قدم رکھتے ہی ہمارے والدین کو ہمارے بڑے ہونے کا احساس ہونے لگا اور انہوں نے مناسب سمجھا کہ میں کالج کو سواری پر جایا کروں چنانچہ آج ہم رکشا پر جانے والے تھے۔ میں نے اب تک اپنے رکشا والے کو نہ دیکھا تھا کیوں کہ غالباً جب اس سے تنخواہ کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی تو میں موجود نہ تھی۔

میں کتابیں بغل میں دبائے تیزی سے باہر نکلی اور ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ رکشا والے کا ایک ہاتھ نہ تھا۔ وہ شاید میری پریشانی کو تاڑ گیا۔ میرے ہاتھ سے کتابیں لیتے ہوئے کہنے لگا "بیٹا آپ پریشان نہ ہوں۔ میرا ایک ہاتھ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ چار چار سواریاں لے کر چلتا ہوں۔ اور خدا کے فضل سے کبھی دھوکہ نہ کھایا" رکشا والے کی یہ طراری کچھ مجھے پسند نہ آئی۔ مگر اس کی صاف زبان کی دل میں قائل ضرور ہو گئی اس دن سے برابر اس کی رکشا میں جاتی رہی۔ اس کی صورت میں ایک مظلومیت کی جھلک مجھکو کبھی کبھی پریشان کر دیتی۔ میرا دل خود بہ خود چاہتا کہ اس سے پوچھوں کہ وہ کون ہے لیکن کچھ کہتے نہ بنتا۔

آج کئی روز کی غیر حاضری کے بعد مرشدہ کالج آئی۔ وہ میری بچپن کی ساتھی ہے۔ ہم دونوں مل کر بہت خوش ہوئے ہم دونوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جو بھی پہلے جاتا اس کو سواری تک آکر رخصت کرتے۔ آج بھی وہ حسب معمول مجھے رکشا تک چھوڑنے

آئی اور چند منٹ کھڑی ہو کر واپس چلی گئی۔ مگر دوسرے دن جب میں پہونچی تو اس نے دو چار رسمی باتوں کے بعد رکشا والے کے متعلق باتیں دریافت کیں مثلاً یہ رکشا والا نوکر ہے کیا؟ "کہاں سے ہے؟ کیسی رکشا چلاتا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ تو ہے ہی نہیں" !! وغیرہ وغیرہ

مرشدہ اب روز مجھے چھوڑنے آتی اور کافی دیر تک ٹھہرتی۔ مجھ سے بات کرتے کرتے وہ ایک ادھ مرتبہ رکشا والے سے بھی کچھ فضول سوال کر لیتی۔ کبھی کہتی رکشا والے! ذرا رکشا ہوشیاری سے چلانا، کبھی کہتی "تم رکشا نہ چلایا کرو، خطرہ ہوتا ہے۔ اور اکثر باوجود ایک بار دریافت کرنے کے کہ رکشا والے کا نام جمو ہے، اس کا نام بار بار پوچھتی مرشدہ بات مجھ سے کرتی مگر نظریں اس کی جمو پر ہی رہتیں۔ اب مرشدہ کی گفتگو کا موضوع صرف جمو تھا۔ مجھے چھیڑتی۔ ذرا سنبھل کر رہنا حمیدہ بیگم! رکشا والا ہے غضب کا۔ خدا خیر کرے۔ کہیں یہ جموں کوئی نیا شگوفہ نہ کھلائے۔" مگر اس نے ان جملوں نے مجھے اس کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی۔ اس کی نظریں اس کے دل کی ترجمانی بن جاتیں اور میں ہاں ہوں کر کے ٹال جاتی مگر اس کے متواتر اصرار پر اور ہر وقت جمو کے ذکر سے کچھ خوف ہونے لگا اور میں نے قطعی ارادہ کر لیا کہ اس سے پوچھوں گی کہ آخر رکشا والے سے مرشدہ کو اس قدر دلچسپی کیوں ہے۔ کئی بار کوشش کے باوجود میں ارادہ میں ناکام رہی۔ لیکن ایک دن جب کہ وہ رکشا والے کے حلیہ پر اس کی شکل پر ایک شاعرانہ تبصرہ کر رہی تھی میں نے اس سے پوچھا' مرشدہ ایک بات پوچھوں۔ سچ سچ بتاؤ گی؟" میرے اس سوال سے وہ کچھ سٹپٹا سی گئی۔ مگر میں نے اس کی گھبراہٹ کی پرواہ کئے بغیر اس سے پوچھ ہی لیا کہ اس کو ہر وقت رکشا والے کی فکر کیوں رہتی ہے۔ میرے پوچھنے سے پہلے تو اس نے ناگواری کا اظہار کیا لیکن شاید اب اس میں بھی اپنے راز کو راز رکھنے کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔ اس نے بے اختیار میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بہت ہی کرب کے ساتھ کہنے لگی "حمیدہ! مجھے تمہارے رکشا والے سے بہت

محبت ہے۔ اچھی حمیدہ خفا نہ ہونا۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ہر وقت اسی کی باتیں کروں۔ اسی کو دیکھوں اور نہ جانے کیا کیا جی چاہتا ہے۔ حمیدہ! کاش تم میرے احساسات کو سمجھ سکتیں مرشدہ کے لفظ "محبت" پر میں چونک پڑی۔ پریشان ہو گئی۔ اف "محبت" ایک رکشا والے سے۔ سماج ہرگز مرشدہ کو اس محبت کی اجازت نہ دے گی عجیب عجیب خیالات میرے ذہن میں آنے لگے۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ وہ غلطی پر ہے۔ دنیا بڑی جگہ ہے۔ یہاں مرشدہ جیسی لڑکی صرف ایک بڑے خاندان سے کر سکتی ہے محبت یا دولت مند کو اپنا محبوب بنا سکتی ہے۔ یاں دولت مند چاہے کسی ذات کا کیوں نہ ہو۔ سماج اس محبت پر آفرین کے نعرے لگانے کو تیار ہے۔ لیکن ایک رکشا چلانے والا اونچی سے اونچی ذات کا بھی محبت کے لائق نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا کہ "مرشدہ! تو غلطی پر ہے خدا کے لئے اپنے اور جمو کے حال پر رحم کر۔ تو جمو کو نہیں پا سکتی۔ سماج کے ظالم ہاتھ' اس سے پہلے کہ تیرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہو جمو کے گلے پر ہوں گے۔ اس کی نعش بھی تجھکو نہ مل سکے گی" میری ان سب باتوں کا مرشدہ پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ وہ میری طرف سے بدگمان ہو گئی۔ اس نے ایک درد اور بے چینی سے کہا "حمیدہ' تم کتنی خوش قسمت ہو کہ جموں تم کو رکشا والے کی حیثیت سے ملا اور تم اس سے ملتی ہو۔ اس سے بات کرتی ہو۔ تم کیا چاہتی ہو۔ کیا تم اس کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی ہو؟" اس کا مرشدہ نے صرف اس قدر جواب دیا کہ وہ خود نہیں جانتی کہ وہ کیا چاہتی ہے؟

خلاف معمول آج مرشدہ بہت ہی خاموش تھی۔ یوں تو جمو کی یاد نے اس کو بے چین کر رکھا تھا مگر آج وہ بہت ہی روہانسی ہو رہی تھی میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ آج اس کے مرحوم بھائی کی ۲۲ ویں برسی ہے۔ آج ہی کے دن اس کا بھائی

جب کہ پانچ سال کا تھا ایک سفر میں ریل کی پٹڑی پر کٹ کر مر گیا تھا میں نے اس کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیل سے نہ پوچھا اور اظہارِ افسوس کرتے لگی۔ آج کالج کے بعد مرشدہ مجھے رکشا تک چھوڑنے نہ آئی۔ جمو نے اس کو محسوس کیا اور اس کے نہ آنے کی وجہہ بہت ہی ڈرتے ڈرتے دریافت کی۔ جمو کے سوال سے مجھے اور بھی فکر ہوئی "کہیں جمو تو مرشدہ کی طرح اس کو نہیں چاہتا"۔ دوسرے روز جب میں کالج جانے لگی تو میں نے راستے میں جمو سے پوچھا کہ اس کا ہاتھ کیوں کر کٹ گیا تھا اور وہ کہاں رہتا ہے۔ آیا اس کے ماں باپ ہیں یا نہیں۔ خیر یہ سوالات تو تمہید تھی۔ میں تو کچھ اور ہی پوچھنا چاہتی تھی جمو نے بتایا کہ جب وہ پانچ سال کا تھا۔ اس وقت اس کا ہاتھ ریل سے کٹ گیا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ دو ریلوں کی ٹکر ہو گئی تھی اور اسی حادثے میں اس کے ماں باپ بھی ختم ہو گئے اسٹیشن کے ایک قلی نے اس کی پرورش کی۔ اب بھی وہ اسی کے پاس رہتا ہے۔ قلی بوڑھا ہو چکا ہے اسی لئے یہہ رکشا چلانے کا کام کرتا ہے۔ اس کے یہہ حالات سن کر نہ جانے کیوں مجھے مرشدہ کا خیال آیا اور ساتھ ساتھ اس کے بھائی کا بھی۔ مگر میں نے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اگر جمو مرشدہ کا بھائی ہوتا تو پھر مرشدہ یہ کیوں کہتی کہ اس کا بھائی مر گیا"۔ لیکن ان باتوں کے معلوم کرنے کے بعد آگے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کالج آکر ایک خالی گھنٹہ میں میں نے مرشدہ سے اس کے بھائی کا نام پوچھا جو اس نے جمیل بتایا۔ پھر میں نے اس کے بھائی کی قبر دریافت کی تو ایک سرد آہ کے ساتھ اس کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہنے لگی۔ بھائی کی موت میری پیدائش سے قبل کا واقعہ ہے۔ بھائی کی نعش نہ ملی تھی لیکن ظاہر تھا کہ اتنے لوگ مرے تھے اس میں پانچ سال کا بچہ کیسے بچ سکتا تھا۔ جس وقت ریلوں میں ٹکر ہوئی ہے۔ جمیل بھائی حیدر کے نوکر کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ نوکر کی نعش تو ملی مگر بھائی کی نہ ملی۔ امی جان کو اس کا بہت صدمہ ہے کہ انکا بچہ بے گور و کفن رہا"۔ اتنا حال بیان

کرتے کرتے مرشدہ بہت رونے لگی۔ اس کی دلجوئی کی خاطر میں نے جمو کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کا نام آتے ہی وہ کھِل اُٹھی۔ میں نے کہا "مرشدہ! اگر تم کو جمو مل جائے تو کیا کروگی؟" کہنے لگی" اس کو اماں کے پاس لے جاؤں گی۔ اس کی تعلیم کا انتظام کراؤں گی۔ اور پھر۔۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔۔!! اتنا کہتے کہتے وہ رک گئی اور کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ وہ یہ سب کچھ کہہ رہی تھی اور اس طرح کہہ رہی تھی گویا اس کو ان سب باتوں کے پورا ہونے کا یقین تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ کتنی بھولی ہے مرشدہ اس کو کیا معلوم کہ اماں کے پاس جاتے ہی جمو کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اس کو شہر بدر کر دیا جائے گا۔ اور پھر مرشدہ اپنی تمام آرزوؤں کے جنازے پر آنسو بہانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکے گی۔

کئی دن میرے پریشانی میں گزر گئے۔ جمو اور مرشدہ دونوں سے مجھے ہمدردی تھی۔ مجھے جمو اور مرشدہ دونوں کی کہانیاں یکساں معلوم ہوتی تھیں۔ مگر ہر زاویہ نگاہ سے مجھے سوائے مایوسی کے کچھ نہ ملتا۔ ایک دن اچانک مجھ کو خیال آیا کہ کہیں جمو مرشدہ کا بھائی تو نہیں؟ اور اس خیال نے میرے دل و دماغ دونوں پر قابو پا لیا۔ جمو کی کہانی مرشدہ کو سنانے کا میں نے پکا ارادہ کر لیا۔ اور جب اگلے دن کالج گئی تو یہ بات میں نے اس کو بتا دی۔ اس بات کو سن کر پھولی نہ سمائی جیسے سچ مچ جمو اس کا بھائی ہو۔ آج مرشدہ وقت سے پہلے گھر پہنچ گئی۔ اور غالباً اس نے جمو کا حال اپنے والدین سے کہدیا۔ کیوں کر جب وہ کالج آئی تو کہنے لگی "آج تم اور جمو معہ اس قلی کے ساتھ جس نے جمو کی پرورش کی ہے میرے یہاں آنا"۔ اور چلتے چلتے تاکید کر گئی۔ چنانچہ شام کو جب جمو آیا تو میں نے قلی کو بلانے کے لئے کہا۔ لیکن معلوم ہوا کہ قلی سخت بیمار ہے۔ بہرحال میں صرف جمو کو لے کر مرشدہ کے گھر پہنچی۔ وہاں بہت اہتمام تھے۔ بہت ہی پر تکلف چائے کا انتظام تھا۔ مرشدہ کی امی

کی بے چینی دیکھنے کے قابل تھی۔ بار بار چلمن سے جھانک کر دیکھ رہی تھیں۔ جمو دنیا اور مافیہا سے بے خبر رکھتا میں دونوں گھٹنے سے پیٹ لگائے کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔ امّی سے اب ضبط نہ ہو سکا اور چلمن کے پاس بلا کر اس سے سوالات شروع کر دیئے۔ میں اور مرشدہ امی کے پیچھے کھڑے ہوئے بڑے شوق اور اشتیاق سے باتیں سن رہے تھے۔ مرشدہ کی بے چینی کچھ عجیب تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بغیر کچھ پوچھے ہی جمو کو بھائی تسلیم کرنے کو تیار تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی۔ کیوں کہ میرا خیال تھا کہ وہ جمو کو کسی اور نگاہ سے پوجتی ہے۔

جمو نے وہی باتیں جو مجھ کو بتائی تھیں امّی کو بھی بتا دیں۔ برآمدے میں ابا اور مرشدہ کے والد ہر بات کو غور سے سن رہے تھے۔ کہانی سنکر فوراً موٹر نکلوائی۔ اور جمو کو ساتھ لے کر قلی کے پاس جا پہنچے۔ قلی نے بتایا کہ ریل کی ٹکر میں بہت سے لوگ اپنے عزیزوں کو نہ پہچان سکے اور گھر سے بے گھر ہو گئے۔ اسی طرح ٹکر ہونے کے تین دن کے بعد جمو اس کو ملا۔ مگر بے ہوش۔ قلی کے اولاد نہ تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ جمو کے ماں باپ حادثے کے نذر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی گاڑھی کمائی جو شاید قدرت نے اس بچے کی زندگی رکھنے کے لئے اس سے جمع کروائی۔ جو اس نے اس بچہ کے علاج میں صرف کر دی۔ بچہ نے اپنا نام جمیل بتایا تھا۔ اس سے آگے بتانے کی اس میں کچھ سمجھ نہ تھی۔

اس بیان کو سن کر ابا نے بے اختیار قلی کو سینے سے لگا لیا۔ امّی نے پردے کے پیچھے سے بہت ہی شکریہ ادا کیا۔ اور دعائیں دیں۔ یہ ایک ایسا منظر تھا کہ جس کو دیکھنا ایک بہت ہی دل والے کا کام تھا۔ میں اور مرشدہ بھی موٹر ہی میں بیٹھے تھے جمو ایک کونے میں بت بنا کھڑا تھا۔ ابا نے اس کو سینے سے لگا لیا۔ اس کی پیشانی کو چوما۔ مرشدہ نے جھٹ اتر کر گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ماں نے ہزاروں بلائیں لیں۔ آج

بائیس سال کے بعد بوڑھے بازوؤں میں پھر سے جان پڑ گئی۔ باپ کے بڑھاپے کی ٹیک ماں کی آنکھوں کا تارہ ایک پھٹی بنیان اور پیوند لگا خاکی نیکر پہنے ماں کے سینے سے لگا ہوا رو رہا تھا۔ ماں اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی جن کو برسوں سے تیل نصیب نہ ہوا تھا۔ فلی اپنی گاڑی کی ان کے تمر کولیوں ہاتھ سے جاتے دیکھ رہا تھا جس کی خدمت میں اس نے رات دن ایک کر دیئے تھے۔ فلی کے چہرے پر مسرت اور حیرت کے ملے جلے اثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ باپ نے کہا "فلی! آج سے تم ہمارے بھائی ہو۔ یہ نہ سمجھو کہ جمیل تم سے چھوٹ جائے گا۔ ہمارا جمیل تمہارا جمو ہی رہے گا۔ جمیل نے آگے بڑھ کر فلی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اس کے منہ کو چوما۔ اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے بابا فلی کو اپنا بابا ہی سمجھے گا۔ باپ کے گھر کی روشنی اور بوڑھے فلی کی زندگی کا سہارا بن کر رہے گا۔

موٹر پر فلی کی پھٹی گدڑی اور فلی معہ جمیل کے مرشدہ کے گھر آگئے آج رات ان کی شب برات تھی۔ مرشدہ نے اس رات مجھے روک لیا۔ اور امی جان کو کہلا بھیجا کہ میں آج گھر نہ آؤں گی۔ وہ خود آ جائیں۔ چنانچہ رات کو سب گھر میں جمع ہو گئے۔ تمام رات رتجگا رہا۔ دوسرے دن ایک بہت بڑی دعوت کے لئے رقعے بانٹ دیئے گئے۔ میں نے پوچھا "مرشدہ! پھر!........ پھر! اکے بعد کیا ہوگا!! مرشدہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا "پھر بھیا سہرا سر ہو جائیں گے اور پھر پیاری سی بھابی آئے گی"۔ مرشدہ کو اس کا بھائی مل گیا۔ وہ اب بہت خوش تھی۔

دو سال ہم کالج میں ساتھ رہے۔ پھر مرشدہ کی شادی ہو گئی۔ تین چار سال کے بعد جمیل کی شادی میں شرکت کا موقع ملا۔ میں دلہن کے ڈوپٹے میں لچکا ٹانک رہی تھی کہ ایک دم پیچھے سے آواز آئی "بیٹا" رکشا دیر سے دروازے پر کھڑا ہے کیا آج کالج نہ جائیے گا!؟ اس آواز کو سن کر میں چونک پڑی۔ پلٹ کر دیکھا تو جمو صاحب آسمانی سوٹ پہنے کھڑے بڑے ٹھاٹ سے مسکرا رہے تھے۔

ابّا جس دن گھر میں ہوتے!!

میں اپنی انمول یادوں کے خزانے سے اس دور کو آواز دے رہی ہوں جب اخبار "پیام"
تمام مخالفتوں اور رکاوٹوں کے طوفانی تھپیڑوں سے گذر کر ترقی کی راہ پر گامزن تھا بلکہ یہ کہوں تو
بے جا نہ ہوگا کہ اس کا عنفوان شباب تھا اور ابا اسکو خوب سے خوب تر کی طرف لیجانے میں منہمک
تھے اور ان کا یہی انہماک گھر میں رہتے ہوئے بھی ان کو گھر سے بے خبر رکھتا۔ سوچوں میں اس قدر گم
رہتے کہ یہ بھی احساس نہ رہتا کہ کون اُن سے مخاطب ہے اور وہ کیا جواب دے رہے ہیں۔

کسی صاحب سے ملاقات کا وقت مقرر ہوا اتفاق سے وہ صاحب آئے تو ابا کو غسلخانے کا دروازہ
کھٹکھٹا کر اطلاع کی گئی۔ باتھ گاؤن پہن کر نکلے اور ڈرائنگ روم کا رُخ کیا کرتے وہ تو شکر ہے
کہ گھر والوں میں سے کسی کی نظر پڑ گئی "ارے بھئی کپڑے تو پہن لیجئے باتھ گاؤن میں کہاں جا رہے ہیں؟
اور ابا لاحول پڑھتے ہوئے کپڑے بدلتے چلے جاتے اکثر قلم عینک یا سگریٹ سامنے ہی رکھے ہوتے
اور ابا سارے گھر میں ڈھونڈتے پھرتے غرض ابا گھر میں رہتے ہوئے بھی اپنی خیالی دنیا میں
کھوئے رہتے۔

اس زمانے میں حیدر آباد میں جمعہ کو تعطیل ہوا کرتی تھی اور گویا یہی وہ دن ہوتا جس دن ابا
گھر میں ہوتے تو پوری طرح ہمارے درمیان! جمعرات کی رات سے ہی جمعہ کی تیاری شروع ہوجاتی
میرے لئے تو عید ہوجاتی مٹھاس ہی مٹھاس!! چھٹی کا دن نئے نئے پروگراموں سے سجایا جاتا
کبھی ہم لوگ پروگرام بناتے کبھی ابا کی طرف سے پہل ہوتی!

ابا بے حد زندہ دل، خوش گفتار طبیعت میں سنجیدگی اور چہل کا انوکھا امتزاج ان کی ہردل
عزیزی کا ضامن تھا۔ چھوٹی چھوٹی مسرتوں سے لطف اٹھانا اور دوسروں کو بھی اس میں شریک

۱؎ : قاضی عبدالغفار صاحب

بنانا ابا کی خاص خوبی تھی۔ پکنک کے پروگرام بنتے تو ان کو کتاب یا اخبار ہاتھ میں لینے کی اجازت نہ ملتی ایسی پابندیاں لگانے میں میں پیش پیش رہتی انھوں نے اخبار ہاتھ میں لیا اور میں نے چھینا!! بلکہ حکم لگاتی کہ لکڑیاں چنے باغ میں بیٹھ کر پوریاں تلی جائیں گی۔ پوریاں بنانے بڑے دعوے سے بیٹھتے کہتے "دیکھ کیسی عمدہ پوری بناتا ہوں" اور جو پھر آٹے کی ریڑ لگتی دیکھنے کے قابل ہوتی۔

کبھی تاش کی بازی لگتی کبھی پچیسی کی بساط بچھ جاتی۔ شطرنج کے تو کھلاڑی مانے جاتے تھے کبھی سنما کا پروگرام بنتا تو میں ٹریجڈی فلم کی رائے دیتی تو کہتے "بھئی زندگی میں کیا کچھ کمی ہے ٹریجڈی کی جو فلم بھی روتے ہوئے دیکھا جائے۔ بھئی کوئی مسخری قسم کی پکچر ہو جائے" آج تو ابا کبھی قہقہہ مار کر نہیں ہنستے تھے۔ پکچر میں ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا اور ابا مسکراہٹ سے آگے نہ بڑھتے۔

کلاسیکی موسیقی میں ابا کو راگ بھیرویں بہت پسند تھا اور ستار ان کا دل پسند ساز تھا اور لوگ گیت سن کر تو کھو سے جاتے امیر خسرو کا پایل سنتے تو آبدیدہ ہو جاتے لوک گیتوں کے لئے کہا کرتے تھے ان میں معصوم اور پاکیزہ دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ جس دن پکنک یا پکچر نہ ہوتی تو گھر پر دوپہر کو عمدہ کھانا بنتا میٹھا اور آم ان کی کمزوری تھے اگر ان کے سامنے ایک آدھ آم کھا کر ہاتھ روک لیتے تو کہتے تھے اس طرح آم کی ناقدری کرنا ہے تو میرے سامنے نہ کھایا کرو میں آم کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

ان یادوں کو تو بس ذرا سا چھیڑ دیجئے۔ ایسی یلغار ہوتی ہے کہ روکنا مشکل ہو جاتا ہے کیا کیا یاد نہیں آتا!! وہ یادگار شامیں ان کا کیا کہنا واہ۔ بھلا اب ایسی شامیں کاہے کو آئیں گی۔

کچھ یادیں

ہر لمحہ اور ہر پل جو گذر جاتا ہے ماضی کے کھاتے میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ قدرت کے اس قانون کو کیا کہئے کہ وقت کے گذرتے ہوئے اس کارواں کے جو نقوش ذہن کے آئینہ پر ابھرتے ہیں یادوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ انسان جس حال میں جیتا ہے اس سے غیر مطمئن اور شاکی رہتا ہے اور عجیب بات تو یہ ہے کہ جب ہی "آج" گذرے ہوئے کل میں بدل جاتا ہے تو انمول بن جاتا ہے۔ فرصت کے اوقات کا بہترین مصرف پڑھنا اور لکھنا ٹھیرا۔ میں نہ افسانہ نگار نہ شاعر۔! کبھی لکھنے کی کوشش کی تو ماضی کی طرف پلیٹ کر دیکھنا پڑا۔ یوں بھی میں حال کی تپش کا مقابلہ کرنے کے لئے ماضی کی ٹھنڈی چھاؤں کا سہارا ضروری سمجھتی ہوں۔ میرے لئے ماضی سے رشتہ توڑنا آسان نہیں یہی وجہ ہے کہ میں نے جب بھی لکھا ماضی سے مانگ کر لکھا!

میرے نزدیک صرف اپنی تسلّی کے لئے لکھنا کافی نہیں، دوسروں کی دلچسپی اور جانے پہچانے لوگوں کی بات بھی ہونی چاہیئے۔ اس مضمون میں بھی میں نے کچھ ایسی ہی کوشش کی ہے۔ سچ پوچھئے تو یادوں کا اکھٹا کرنا کوئی کھیل نہیں کبھی تو انھیں ادھر اُدھر سے پکڑنا پڑتا ہے اور کبھی ان سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی شریر چنچل بچے کو پکڑ کر آپ اس کا سر چومنا چاہیں تو وہ آپ کی

گرفت سے نکل کر دور جا کھڑا ہوا اور شرارت بھرے لہجے میں کہے ہمیں پکڑ دیا اور کبھی دوڑ کر خود ہی باہوں میں سما جائے۔

بچپن کی یادیں حسین بھی ہوتی ہیں اور عزیز بھی۔ میری شرارتوں کا سلسلہ بچپن کی حدیں پار کرنے کے بعد بھی بہت دن تک جاری رہا میں شرارتوں کی تفصیل میں نہیں جاؤنگی لیکن خالہ بی کے ایک جملہ کی خاطر اتنا ضرور لکھنا پڑے گا کہ میری شرارتوں کے آگے بے بس ہو جاتیں تو بے اختیار پکار اٹھتیں "یا اللہ میری بچی کو سنجیدگی عطا کر" ان کی دعا قبول تو ہوئی لیکن ہماری سنجیدگی کا فیض ان کو نصیب نہ ہوا اور ہوتا بھی کیسے کہ ہمارے قہقہے تو انھیں کے ساتھ دفن ہوئے کیا یہ ممکن تھا کہ وہ زندہ ہوتیں اور ہم میں سنجیدگی پیدا ہو جاتی۔ یہاں تو نا ترکرے نا زیردار کے ساتھ والا معاملہ تھا۔! آج بھی کمسن لڑکیوں کے قہقہے سنتی ہوں تو خالہ بی کی دعا کانوں میں گونجنے لگتی ہے اور میں گھبرا کر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتی ہوں اور اللہ پاک سے التجا کرتی ہوں " اللہ میاں تو خالہ بی کی دعا قبول نہ کر ان بچیوں کے قہقہے اور طویل کر دے کہ یہ بزرگوں کی زندگی کی ضمانت ہیں۔۔۔!!

سمجھ میں نہیں آتا ماضی کی ان رومان پرور داستانوں کو کہاں سے شروع کروں چلئے بچپن ہی کا سہارا لیتی ہوں۔ یہ لکھنؤ ہے۔ میرے بچپن کی بہت سی یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں" کرامت حسین گرلز کالج جو اس زمانے میں مسلم گرلز ہائی اسکول کہلاتا تھا سات سال کی عمر میں میں یہاں داخل ہوئی بورڈنگ میں رہتی تھی۔ یہ اب بھی میرے خوابوں میں آتا ہے۔ مل جل کر جینے کا سلیقہ اس کی دین ہے۔ چھپّر والا اسکول اس کے ماسٹر صاحب اور دیدی جن کی شفقتیں سر پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ دوستوں کے معاملہ میں ہمیشہ بڑی خوش نصیب رہی۔ ایک چہرہ

ذہن کے پردے پر ابھر رہا ہے یہ سانولی سلونی تیکھے نقش و نگار والی لڑکی میری عزیز سہیلی عینی ہے۔ میں عمر میں اس سے بڑی وہ کلاس میں مجھ سے بڑی جی ہاں اس نے بہت کم عمری میں اور تیزی سے تعلیمی مراحل طے کئے۔ ہم دونوں کے اسکول الگ الگ تھے اکثر لوگ سمجھتے ہیں ہم اسکول کے ساتھی ہیں۔ ہم نے کبھی ایک اسکول میں بھی ساتھ نہیں رہے ہماری دوستی ہمارے بزرگوں کا ورثہ ہے جن کے پاس دوستی کا سلسلہ خاندان در خاندان چلتا تھا۔ اور رشتہ داریں دوست تمیز کرنا مشکل ہوا کرتا تھا۔ کیا دن تھے وہ بھی ڈسمبر کا مہینہ اسکول کو تعطیلات وہ بھی تین ہفتے کی اور کیا چاہیئے۔! کبھی میں عینی کے گھر اور کبھی وہ میرے یہاں آجاتی گھر کے وسیع لان کے ایک گوشہ میں سایہ دار درخت کے نیچے ہم ڈیرا ڈال دیتے اور پھر خدا جانے کیا کیا باتیں کرتے اپنی ہی باتوں پر خود ہی حیران ہوتے اور کبھی سوچ میں ڈوب جاتے اس عمر میں ہر چیز نئی اور انوکھی لگتی بے اختیار اس کی تہہ میں اتر جانے کو جی چاہتا۔ باتوں کا خزانہ ختم ہوتا تو ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے یہ ہارمونیم اتنا چھوٹا تھا کہ ہارمونیم کا بچہ لگتا تھا عینی اب بھی اس کی خیریت پوچھتی ہیں۔ عینی بجاتی بھی اور گاتی بھی اکثر فلمی گانے چلتے ہماری آواز بھی شامل رہتی۔ رفتہ رفتہ غزل پر اتر آتے

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

یہ اس زمانے میں ان کی پسندیدہ غزل تھی اور اس قدر خوبصورت انداز میں گاتی کہ جی چاہتا وہ گاتی ہی رہے۔ اللہ پاک نے عینی کو فنون لطیفہ عطا کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا۔ اس کو جتنا اپنے قلم اور علم پر اعتماد ہے اتنا ہی دوسرے فنون میں بھی دخل ہے موسیقی، رقص، اداکاری مصوری ان میں سے کسی کو بھی اپنائی تو اتنا ہی نام کماتی جتنا آج ادب میں ہے۔ بہر حال جب گلے بازی سے تھک جاتے تو

دونوں لان پر اوندھے لیٹ جاتے پھول اخبار سامنے بچھا لیتے اور مطالعہ شروع ہو جاتا ان ساری مصروفیات کے باوجود کان ہر وقت خوانچہ والے کی آواز پر لگے رہتے کبھی گڑ کی لیا خریدی جا رہی ہے تو کبھی کچالو اور چاٹ ابھی سونٹھ کے بتاشے ختم نہیں ہوئے کہ مونگ پھلی کی سوندھی سوندھی خوشبو نے اپنی طرف متوجہ کر لیا غرض سارا دن منہ بھی چلتا اور زبان بھی شام کو جب پھپھی چلی جاتی اور میں آپا کو تمام دن کی رپورٹ دیتی تو چٹوریں کی فہرست سن کر آپا دہل جاتیں "کتنی مرتبہ تجھے سمجھایا کہ بازار کی چیزیں پھپھی کو مت کھلایا کر خدا نہ کرے اس کی طبیعت خراب ہو گئی تو نذر خالہ میری جان کو آجائیگی۔ دیکھو کہے دیتی ہوں اگر آئندہ کسی خوانچہ والے کو گیٹ کے اندر بلایا تو خالہ سے کہہ کر پھپھی کا یہاں آنا بند کرا دونگی" نذر خالہ بڑی دکھی رہتی تھیں انھوں نے کئی بچوں کا داغ جھیلا تھا اب ان کے دل میں اتنا ڈر بیٹھ گیا تھا کہ وہمی ہو چلی تھیں حد سے زیادہ محتاط رہتی تھیں اور بچوں کو بے حد پرہیز کراتی تھیں اسی لئے آپا مجھے بھی تنبیہ کرتی رہتی تھیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہم ان کی باتیں سنتے تو بڑی سعادت مندی سے تھے لیکن عمل کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ بقول حالی "بچپن کا زمانہ جو کچھ حقیقت میں بادشاہت کا زمانہ ہے ایک ایسے پر فضا میدان میں گذرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا" لیکن نہ جانے اس بادشاہت کو کس کی نظر کھا گئی کہ ہم یوں بچھڑے جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے کون جانے وقت کی آندھی کشتوں کو کہاں سے کہاں اڑا لے گئی ہماری دوستی ماضی کا خواب بن کر رہ گئی۔

پھر سجاد حیدر اور نذر سجاد کی آنکھوں کا نور دنیائے ادب پر قرۃ العین حیدر بن کر نمودار ہوئیں۔ اس کی شہرت بڑھتی گئی ادبی محفلوں میں چرچے ہونے لگے میں سنتی خوش ہوتی اور خاموش رہ جاتی نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال ہوا کہ وہ مجھے بھول گئی۔ اور میں کسی کو یہ کہنے کا موقعہ دینا نہیں چاہتی تھی کہ کہا جائے "ہاں

صاحب مشہور ہستیوں سے تو لوگ کھینچ تان کر ناتا جوڑ ہی لیتے ہیں۔"

پھر اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ ایک مشاعرہ میں جس میں ساحر لدھیانوی بھی شریک تھے جانے کا موقعہ ملا جیلانی بانو (مشہور افسانہ و ناول نگار) میرے قریب ہی بیٹھی تھیں اپنا تعارف کرانے کے بعد انھوں نے پوچھا "آپ قرۃ العین حیدر کو جانتی ہیں" اس اچانک سوال پر میں سٹپٹا سی گئی اور کوئی معقول جواب نہ سوجھا تو کہنا پڑا جی ہاں جانتی تو تھی "جیلانی بانو نے بات آگے بڑھائی" میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ عینی آپا کا خط آیا تھا انھوں نے لکھا ہے میری بہت پیاری سہیلی فاطمہ حیدرآباد میں رہتی ہے اس سے ملو تو میرا بہت بہت پیار و سلام کہنا" مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا یہ میں کیا سن رہی تھی خوشی اور حیرت کی اس وقت جو ملی جلی کیفیت تھی اس کو شاید میں الفاظ نہ دے پاؤں۔ شہرت کی اتنی بلندیوں سے اس نے اپنی گمنام سہیلی کو پیار بھیجا تھا۔ جہاں میرے لئے ایک خوشگوار اور انوکھا تجربہ تھا وہیں جیلانی بانو سے پہلی ملاقات بھی یادگار بن گئی بلکہ خلوص و پیار میں ڈھل گئی جب بھی بمبئی آگیس تو حیدرآباد آنے والوں کے ہاتھ عینی کے سلام و پیار کے تحفے ملتے رہے۔

1971 میں میرا بمبئی جانا ہوا۔ IMPRINT کے دفتر فون کیا میری آواز سن کر عینی نے پوچھا کیا تم فاطمہ بول رہی ہو 24 سال بعد فون پر میری آواز پہچان لینا واقعی کمال ہے۔ اور پھر جب ہم ملے تو جیسے بچپن لوٹ آیا نہ کتابوں کی باتیں ہوئیں نہ لکھنے پڑھنے کی بس پرانی یادیں تھیں اور ہم تھے عینی کوئی پرانی بات شروع کرتی میں جملہ پورا کر دیتی میں کوئی قصہ چھیڑتی تو وہ اس کا سرا تھام لیتی ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ارے ہم لوگوں کو تو سب یاد ہے ملاقاتیں اب بھی سالوں میں ہوتی ہیں مگر پیارے پیاموں کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

سوچوں کے دھا... پھر ایک اور یاد ابھر رہی ہے جی چاہتا ہے ...

سب کو شریک رکھوں۔ چاہئے اس پگڈنڈی تک چلیں جس کو شملہ کہتے ہیں اور یہ پگڈنڈی اس گھر تک جاتی ہے جہاں ہم کسی زمانے میں گرمیاں گذارنے آیا کرتے تھے اس گھر کا نام THE RETREAT تھا آزادی کے بعد اس کی بڑی تاریخی حیثیت ہو گئی تھی۔ اندرا بھٹو ملاقات اور شملہ معاہدہ اس گھر میں ہوا تھا کہتے ہیں شملہ معاہدے کے چند دن بعد ہی یہ گھر نذر آتش ہو گیا کیسے ہوا اللہ بہتر جانتے بہت شاندار گھر خود شملہ بھی بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ قدرت نے حسن بخشنے میں بڑی دریادلی سے کام لیا ہے۔ ہر سال وائسرائے یہاں گرمیاں گذارنے اپنے پورے عملے کے ساتھ آیا کرتا تھا اسی لئے ماموں میاں بھی آتے تھے۔ اس سال وہ وزیر تجارت کے فرائض انجام دے رہے تھے اس لئے ذرا ٹھاٹ باٹ کچھ زیادہ ہی تھے ۔!

یوں تو ہر سال شملہ آتے تو گھر مہمانوں سے بھرا رہتا لیکن اس سال یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمانِ ادب کے چاند سورج ہمارے آنگن میں اتر آئے ہیں یہ دبلی پتلی گندمی رنگت غلافی اور سرخی سے آراستہ چہرے والی اپنے زمانے کے جدید طرز کی دوہرے بل کی ساری میں لپٹی لپٹائی ہماری مہمان تھیں حجاب امتیاز اپنے زمانے کی لکھنے والیوں میں منفرد انداز کی حامل ان کی کہانیوں کے بعض کردار جیسے بوڑھی زوناش اور پھوپھی زبیدہ ابھی تک یاد ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ حجاب کو دنیا کی پہلی مسلمان ہوا باز خاتون کا اعزاز حاصل ہے ۱۹۳۶ء میں ان کو ہوائی جہاز چلانے کا سرٹیفکیٹ ملا تھا۔ ادیب مالیگانوی نے منظوم مبارک باد پیش کی تھی چند شعر نقل کر دوں تو ضرور دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ اس نظم کا نام تھا حجاب کی ہوابازی پہلا شعر تھا۔

کیا حجاب کی جرأت نے بے حجاب یہ راز
کہ ہے قفس کے اسیروں میں طاقتِ پرواز
توہمات نے گھیرا ہو جس کو صدیوں سے
یہ واقعہ بھی ہے اس قوم کے لئے اعجاز
یقین اہلِ قدامت کو نہیں آسکتا
"کنیز خانہ" کہاں اور کہاں ہوائی جہاز
ہزار فخر کے قابل ہے کامرانی شوق
مٹا کے رکھ دیئے اندیشہ ہائے دُور و دراز

ہم سوچتے ہیں تخیّل کی پرواز کے آگے بیچارے ہوائی جہاز کی اڑان کی حقیقت ہی کیا ہو گی۔ انھیں دیکھئے دوہرا جسم دراز قد چوڑی پیشانی ہنستی آنکھیں سوٹڈ بوٹڈ یہ سراپا ہے سید امتیاز علی تاج کا ان دونوں سے لگی گھوڑی ہیں ان کی لاڈلی ½2 سالہ یاسمین جو اردو امیز انگریزی میں بات کرتی ہیں۔ والدین کا جاری کردہ تہذیب نسواں اور پھول کی ادارت تاج صاحب ہی سنبھالے ہوئے تھے آج تک ان پرچوں کو یاد کیا جاتا ہے ڈرامہ انارکلی اور چچا چھکن تاج صاحب کی وہ تخلیقات ہیں۔ جنہوں نے ملک میں دھوم مچادی تھی۔ تاج صاحب کی بھتیجی حمید صاحب کی لڑکی ثریا جو تقریباً میری ہی ہم عمر بے حد ملنسار بے باکی کی حد تک بے تکلف خوش شکل اپ ٹو ڈیٹ پھوپی اور میری بھانی سے بہت مشابہ شلوار قمیص میں ملبوس نفاست اور سلیقہ اعلیٰ ذوق کی گواہی دے رہا تھا۔ یہ سب لوگ لاہور سے تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں لاہور ہندوستان کا پیرس کہلاتا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر یقین آگیا۔

یہ تین عدد مراد آباد سے تشریف لائے تھے یہ تھے ... بچا ان کے

نام کے ساتھ بار ایٹ لا لکھا جاتا تھا ہمارے خاندان کے یہ پہلے فرد تھے جو تعلیم کے لئے ولایت گئے تھے وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی خاندان والے ان کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے کوئی عجیب الخلقت چیز ہوں۔ ان کے دونوں لڑکے حامد بھائی اور محمود بھائی بھی ساتھ تھے وضع قطع کے اعتبار سے صاحب بہادری تینوں پر ختم تھی خدا کا شکر ہے مزاج ہندوستانی رہا۔ چھریرا بدن کھلتا ہوا رنگ مختصر سی سیاہ داڑھی سیاہ ذلفیں شانوں پر لہراتی ہوئی سیاہی مائل سیتر ڈھیلا ڈھالا لباس گلے میں مفلر کی طرح رومال پڑا ہوا جو گوشہ نشینیہ لوٹی آنکھوں کی شوخی کو سرمے کی لکیر نے تیز تر کر دیا تھا غرض فقیری میں امیری کی آن بان لئے بات بات پہ ہنستے ہنساتے تشریف فرماتے تھے حضرت خواجہ حسن نظامی" نظامی بنسری کے خالق قلم کے بادشاہ صوفی منش۔ انشاء پردازی کے جوہر دیکھنے ہوں تو "الو" پڑھئے بے جان کو جاندار ہوتے دیکھنا ہو تو "دیا سلائی" پر نظر ڈالئے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم منادی میں روزنامچہ پڑھئے۔ قابلِ مبارکباد ہیں خواجہ حسن ثانی نظامی کہ اپنے والد بزرگوار کے روزنامچہ کو دوہراتے ہیں جسکی تاریخی حیثیت بھی ہے۔ اور تو سب سے کچھ نہ کچھ رشتہ ہے لیکن خواجہ صاحب دوست تھے اس زمانے میں سچ مچ کے دوست ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے روزنامچہ میں لکھا تھا "مولانا سر محمد یعقوب گول میز کانفرنس کی کمیٹی کے کاموں میں مصروف ہیں ان کو بھی سر شفیع کی طرح بعض لوگ سرکاری خیر خواہی کے طعنے دیتے ہیں۔ مگر جب سر یعقوب دنیا میں نہ ہونگے تو یہی طعن کرنے والے ماتم کریں گے اور کہیں گے کہ یعقوب رات دن مسلمانوں کے لئے کاموں میں مصروف رہتے تھے اور ان کے دل میں قوم کی محبت کا شعلہ ہر وقت بھڑکتا رہتا تھا۔ یہ تھے تاثرات خواجہ صاحب کے ماموں میاں کے بچپن کے دوست ہم وطن اور ہم جماعت سر رضا علی مع اپنی ہندوستانی نژاد فرینقین بیوی اور سالی کے ساتھ موجود تھے ٹھیرے تو تھے کاٹیج ہی لیکن زیادہ

وقت ہمارے ساتھ ہی گذرتا تھا۔ شملہ کے وہ دن یادگار بن گئے۔ دن بھر سیر سپاٹے کرتے پگڈنڈیوں کے راستے پہاڑوں کی تہہ لاتے کبھی باغوں میں گھس کر پھل توڑتے بلا سے باغ کسی کا ہو۔ اسڑکوں کے کنارے لگے ناشپاتی کے درختوں پر لنگوروں کا پڑاؤ ہوتا پھل توڑنے کی کوئی صورت نہ نکلتی تو ایک پتھر لنگوروں کی طرف اچھال دیتے بس پھر کیا تھا بچی ناشپاتیوں سے لنگور پتھراؤ کر دیتے چوٹیں کھاتے جاتے اور پھل چنتے جاتے اس طرح رخت سفر ساتھ لے کر کسی گھاٹی کی طرف مڑ جاتے ان دنوں میرا اٹاپا انتہا پر تھا دو نازک قسم کی خواتین کے درمیان جو اور بھی نمایاں ہو جاتا اور مجھ میں احساسِ کمتری پیدا ہونے لگتا اور محمود بھائی تو ہر وقت میرا موڈ خراب کرنے پر تلے رہتے پہاڑی راستوں کے اتار چڑھاؤ سے گذرتے ہی محمود بھائی ہانک لگاتے "ارے بھائی مڑ مڑ دوں کا تھیلا کسکا ہے۔ وہ دیکھو سامنے لڑھکتا جا رہا ہے" میں بگڑ کر سڑک پر ہی بیٹھ جاتی "جائیے میں نہیں آتی آپ لوگوں کے ساتھ اور آئندہ بھی نہیں آؤں گی" محمود بھائی انجان ہو کر پوچھتے "ارے تو یہ تم تھیں بھئی معاف کر دو دھوکہ ہو گیا تھا۔ کان پکڑ کر توبہ کرتے اور قافلہ آگے بڑھ جاتا نہ وہ چھیڑنے سے باز آتے نہ ہم اپنے عہد پر قائم رہتے۔ موسم زیادہ سرد ہو جاتا یا بارش ہو جاتی تو گھر پر ہی انگیٹھیاں سلگائی جاتیں کڑھائی چڑھتی اچھا خاصہ ساون کا ماحول بن جاتا۔

آئے دن پکنک کے پروگرام بنتے کبھی کسی باغ میں کبھی کسی وادی میں کبھی چٹانوں میں ایک دن یو ٹرزہل جانے کا پروگرام بنا۔ یوٹرزہل کی طرف جو راستہ جاتا تھا اس پر ایک چکنی تنکے نما گھاس۔ بچھی ہوئی تھی اس پر چلنا گویا پل صراط سے گذرنا تھا چکنی گھاس اس پر راستوں کے نشیب و فراز چلتے تو دو قدم آگے تو چار قدم پیچھے ہر قدم پر قلابازی کھا جانے کا ڈر کسی کا پاؤں پھسلتا تو قہقہے بلند

ہوتے قدم اور ڈگمگا جاتے مارے ہنسی کے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا بہرحال گرتے سنبھلتے کسی طرح منزل تک پہونچ ہی گئے۔ یہ بڑا پر فضا مقام تھا ایک چھوٹا سا ریسٹوراں بھی تھا انگریزوں کا سلیقہ اور نفاست یہاں بھی موجود تھی، باوردی لڑکے بڑی مستعدی سے جا بجا بچھی میزوں پر ڈیوٹی انجام دے رہے تھے ہم سب کا ایک میز پر سمانا مشکل تھا اس لئے دو میزوں پر قبضہ کیا گیا۔ رضا علی چچا بے حد زندہ دل انسان تھے ان کی میز ہماری جگہ سے ذرا اونچی تھی۔ اپنی میز سنبھالتے ہی تان لگائی "راجہ باجہ اوپر بلی نیچے" اس حرکت سے سب کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

کھیل کود کی جگہ کے علاوہ جھولے بھی پڑے تھے رضا علی چچا نے جھولے پر جھوٹکو کا مقابلہ رکھ دیا کہ دیکھیں کس کا جھونکا سب سے آگے رہتا ہے خود بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس وقت ان کی عمر 56 یا 57 سال رہی ہوگی ہمارے نزدیک وہ جھولا جھولنے کی عمر پار کر چکے تھے اور اس وقت ان کا جھولا جھولنا گویا بوڑھے مہاسے کے مصداق تھا اس وقت یہ خیال ہی نہیں آتا تھا کہ ہم بھی کبھی بوڑھے ہوں گے وقت کس طرح پر لگا کر اڑ جاتا ہے۔ اب نوجوان رضا علی چچا کا بدلہ ضرور ہم سے لیتے ہوں گے۔!

غرض دن یوں گذرتے اور شام کو کبھی حالات حاضرہ پر تبصرے ہوتے کبھی خالص ادبی ماحول بن جاتا خواجہ حسن نظامی کا شمار چوٹی کے لکھنے والوں میں ہوتا تھا امتیاز علی تاج اور حجاب بھی دنیائے ادب میں معتبر سمجھے جاتے تھے رضا علی چچا کا "اعمال نامہ" راز میں تھا جو بہت بعد میں چھپا۔

حجاب پھپا کے ناول "ظالم محبت" کی پہلی قسط ساقی میں شملہ کے دوران قیام چھپی۔ مجھے یاد ہے جیسے ہی پرچہ آیا وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھولا اپنی کہانی نکالی اور پہلا کام یہ کیا کہ ظالم کو کاٹ کر اس کی جگہ "دستور" لکھ دیا میں انھیں کے قریب

بیٹھی تھی میں نے کہا ارے بچی یہ آپ نے کیا کیا" کہنے لگے میں تو تو محبت "ہی لکھنا چاہتی تھی مگر پڑھنے والے کہتے اس عورت کی زبان کتنی خراب ہے اس لئے ظالم لکھنا پڑا۔ شاید ساقی کا وہ پرچہ آج بھی ان کے پاس محفوظ ہوگا اور جب اس کو دیکھتی ہوں گی تو یعقوب بھائی کے ساتھ موٹی چھوٹی بلے ڈھنگی سی فاطمہ ان کو ضرور یاد آجاتی ہوگی۔

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا پرچہ منادی روزنامچہ کے لئے مشہور تھا ہر چھوٹی بڑی اہم غیر اہم بات چھپ جایا کرتی تھی حجاب نے ایک دن پوچھا خواجہ صاحب آپ نے اپنے روزنامچے میں میرے بارے میں کیا لکھا ہے ہنس کر بولے "میں نے لکھا ہے گلاب کی ٹہنی کی طرح نازک پھول کی طرح شگفتہ نام حجاب ہے۔ لیکن بہت بے حجاب ہیں" یہ سن کر حجاب بہت بیٹا ئیں لیکن جب منادی آیا اس میں اپنی تعریفیں پڑھیں تو خوشی سے پاگل ہو اٹھیں۔ اسی منادی میں محمود بھائی کا موٹروں سے شوق دیکھ کر ان کو موٹر نواز جنگ کا خطاب دے ڈالا دیکھتے ہی دیکھتے وقت پر لگا کر اڑ گیا ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے شملہ کا یہ سفر ہمارے لئے بھی آخری سفر ثابت ہوا ایسا معلوم ہوا جیسے گل ہونے سے پہلے چراغ کی لو بھڑک کر خاموش ہو گئی ہو۔ کیسے شائستہ' مہذب' باوقار اور شگفتہ مزاج تھے یہ لوگ ان کے احترام میں خود بخود سر جھک جایا کرتے تھے ۱۹۸۲ء میں جب عینی حیدر آباد آئیں تھیں تو ایک دن جب ہم لوگ اگلے وقتوں کا ذکر لے بیٹھے عینی کہنے لگیں "لوگ مجھ سے طنزاً کہتے ہیں آپ اپنی تحریروں میں ان گزشتہ لوگوں کو بالکل فرشتہ بنا کر پیش کرتی ہیں" وہ کہنے لگیں اصل میں کردار کے بحران نے ان لوگوں کو CYNICAL بنا دیا ہے" عینی نے بالکل سچ کہا۔ اب نہ وہ محبت و مروت کے پیکر رہے نہ وہ ہستیاں رہیں جن کو

دیکھ کر ایثار و قربانی کا مفہوم سمجھ میں آتا تھا سب خواب و خیال ہو گئے کہانیاں بن گئے وہ لوگ! ایسا لگتا ہے خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

معذرت

محترمہ فاطمہ عالم علی صاحبہ نے اس کتاب کی تاخیر میں میرے قصور کو نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ میرے گھر کی تعمیر اور شخصی کاموں کی وجہ سے اس کتاب کی تیاری میں تاخیر ہوئی ہے جس کے لیے میں محترمہ فاطمہ عالم علی صاحبہ سے معافی کا طلبگار ہوں اور اس کتاب میں اگر کہیں غلطی نظر آئے تو درگذر کیجیے گا۔

محترمہ فاطمہ عالم علی صاحبہ نے میرے لیے دلی اور قلمی دعا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول فرمائے۔ (آمین)

محمد محمود احمد

کیلی گرافر

یادش بخیر

حصہ دوم ”طنز و مزاح

فاطمہ عالم علی

اکبر الہ آبادی کے نام کھلا خط

میں نے کہا آداب عرض ہے اکبر صاحب

خدا کے لئے اسقدر گھور کر میرے خط کو نہ دیکھئے ۔ اوہو ! اچھا !! میں سمجھ گئی !! واقعی گستاخی ہوئی ۔ اس طرح اکبر صاحب کہہ کر مخاطب نہیں کرنا چاہیئے تھا ۔ لیکن ایک گذارش ہے آپ سے ! آپ ہی سوچیئے میں آپ کو دوستانہ انداز سے مخاطب نہ کروں تو پھر جو بات میں لکھنا چاہتی ہوں کیسے لکھوں گی ۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ اگر چچا کا رشتہ لگا لیا ہوتا تو کیا ہرج تھا ۔ قبلہ ! چچا تو چھوڑیئے میں تو آپ کو دادا بھی کہہ لوں لیکن سوال یہ ہے کہ آپ جیسے غیر معمولی حضرات کے نام کے ساتھ معمولی سے رشتے ناتے جوڑ دینا کہاں تک مناسب ہے اب یہی دیکھئے نا اگر آپ کو بجائے اکبر الہ آبادی کے میاں عشرت کے والد کہنے لگیں تو کتنا عجیب لگے گا ۔ یہ رشتے ناتے تو پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ ہر شخص کسی نہ کسی کا باپ یا چچا ہوتا ہے ۔ آپ تو وہ ہیں جو ہر کوئی نہیں ہو سکتا یعنی کہ شاعر !! اور وہ بھی کیسا کہ ظریف بھی ہے طنز نگار بھی ۔ عالم بھی ہے اور عارف بھی ۔ اتنی ڈھیر ساری صفات کو چھوڑ کر آپ کہیں کہ چچا جان یا دادا جان کہو تو دل گوارہ نہیں کرتا ۔ ہاں تو اکبر صاحب ایک بار پھر گستاخی کی معافی چاہتے ہوئے اجازت چاہتی ہوں "اکبر صاحب" سے مخاطب کرنے کی ۔ ویسے سر حاضر ہے جو چاہے سزا دیجئے اور یہ ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ سزا و جزا کے قائل نہیں "سانپ مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے" کے اصول پر عمل کرتے ہیں آپ تو ۔ !

بات یہ ہے اکبر صاحب میں یوں تو خط لکھنے کے معاملے میں بہت چور ہوں خط لکھنے کے خیال سے ہی وحشت ہوتی ہے ۔ لیکن چند دن پہلے ایک میگزین پر نظر پڑی جو اکبر نمبر تھا

جی جی بالکل آپ کا بجز بلا شرکت غیرے آپکا!! اس میں آپکی شان میں اتنا لکھا گیا اتنا لکھا گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ قلم ٹوٹ گئے ہونگے یوں تو کسی نے آپ کی ظرافت پر لکھا کسی نے طنز پر، بعض حضرات نے آپکو صوفی بناڈالا کسی نے اکبر میں عارف کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ اتنا تو بتادیتا کہ دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی آپ نے بیسویں صدی کی ابتداء ہی دیکھی اور اب اکیسویں صدی کی آمد آمد کی دھوم ہے آج سے ساٹھ پیسٹھ (۶۰،۶۵) برس پہلے لکھتے ہوئے آپ کے اشعار آج کے ماحول سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں یہی سب سوچتے سوچتے میں نے سوچا کیوں نہ میں بذریعہ خط موجودہ حالت سے آگاہ کردوں۔

اب دیکھئے نا آپ کے زمانے میں مس ہوا کرتی تھی آجکل کماری ہے آپ نے میم صاحب کو مخاطب کیا ہے اور اب شریمتی جی ہیں میرا خیال ہے بات یوں نہ بنیگی کیوں نا آپکے اشعار کے ساتھ بات واضح کی جائے کیا خیال ہے اکبر صاحب آپکا؟ مجھ سے متفق ہیں نا آپ؟ تو سنئے آپ ایک جگہ کہتے ہیں۔

بوئے وفا نہیں مسوں کے اصول میں ــــ بس رنگ دیکھ لیجے گملے کے پھول میں

تو جناب وہ جنھیں سمجھتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے یعنی مسوں کا پتہ کٹ گیا ان کی جگہ کماریاں ہیں۔ رہی بوئے وفا کی بات تو نہ جب تھی نہ اب ہے۔ کم ازکم آپکے زمانے میں گلدانوں میں سجے کاغذی پھول خوشبو نہیں تو بدبو بھی نہ دیتے ہونگے آجکل تو باغ کے پھول بھی کاغذی معلوم ہوتے ہیں مصنوعی کھاد کے استعمال نے پھول کا مزاج ہی بدل ڈالا اب کماریاں گملوں میں نہیں بس اسٹینڈ پر دستیاب ہوتی ہیں!!

افسوس کہ لباس کے متعلق بھی آپکا فرمایا ہوا کشش کھوچکا ہے۔ مثلاً آپ کہتے ہیں۔

سایہ مؤنث ہوئی غبارہ بنا۔ پائنچوں میں ا[illegible] بھری ہے ہوا ــ آپ کی یہ بات بالکل OUT OF DATE ہے یعنی سایہ تو سرے سے غائب ہے ہوا بھرے پائنچوں سے نہ جانے آپکی مراد کب بلہ ہے خدا جانے پتلون کی طرف اشارہ ہے یا شلوار کی طرف لیکن آپکی معلومات کے

لئے عرض ہے کہ ساڑے کی ہوا تو نکلی ہی تھی اب تو شلوار اور پتلون کی ہوا بھی نکل کر ٹانگوں سے چمٹ گئی یہ لباس جوان بوڑھے دونوں کے استعمال میں ہے پتلون کی تو یہ حالت ہے کہ دور سے دیکھئے تو معلوم ہو کہ دو غلاف چڑھی بندوقوں کو پاؤں لگ گئے ہیں۔ شلوار آپ کے زمانے میں پانچ گز سے کم میں کیا بنتی لیکن آجکل ۲½ گز میں تیار ہوتی ہے اور دیکھنے میں شرعی پاجامہ کی بدلی ہوئی شکل ہے دیکھئے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اسکو مردوں کے لباس میں شامل کرلیں اکبر صاحب! یہ تو آجکل کی کماریاں پہنتی ہیں اور بڑی اسمارٹ لگتی ہیں شاید آپکو معلوم نہیں کہ زمانہ حال میں نہ صرف لباس میں بلکہ خود مرد اور عورت میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے اور کیوں نہ ہو جناب یہ برابری کا دعویٰ کچھ یوں ہی تو نہیں۔ آپ کے زمانے میں داڑھی موچھ صاف تھی تو سر کے بالوں سے مرد اور عورت پہچانے جاتے تھے یعنی اتنا تو تھا کہ بال پیشانی اور گدی تک نہ آپاتے تھے آجکل خدا جھوٹ نہ بلائے تو ان دونوں نے بالوں کا اچھا خاصہ مقابلہ کر رکھا ہے۔ اور وہ دن زیادہ دور نہیں کہ مردوں کو بھی میاف اور بالوں کے پن کا استعمال کرنا پڑے ایسے مردوں کی قطاریں آپکو سینما حال کے ٹکٹ گھر کے سامنے نظر آئنگی آپ دیکھ پاتے تو یہی سمجھتے کہ مغل دربار کے خواجہ سرا بھیس بدل کر شہر میں نکل پڑے ہیں۔!!

آپ کے وہ دو شعر بھی خوب ہیں جس میں آپ نے اپنے زمانے کی عاشقی کا نقشہ کھینچا ہے۔

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا۔ لڑکا جو میں نے بولے بس بس خاموش رہنا۔۔۔۔
حسن و جنون بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن ـــ ہے لطف بحر ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

اطلاعاً عرض ہے آجکل لیلیٰ سایہ نہیں بلکہ SACK پہنتی ہے اور مجنوں نے تو کوٹ مدتیں ہوئیں پہننا چھوڑ دیا آجکل وہ ٹی شرٹ یا بشرٹ میں نظر آئینگے واقعی آپکے لئے یہ دونوں نام نئے ہیں آپ نے تو انگریزی میں بشرٹ اور اردو میں قمیض سنا ہوگا یہ ان دونوں کے درمیان کی چیز ہے یعنی آپ کے زمانے کی فیشن ایبل خواتین جو جمپر پہنتی تھیں وہ اب سامنے سے کھول کر بشرٹ بنا دیا گیا یہ پتلون کے باہر رہتا ہے غالباً پتلون کمر پر اسقدر تنگ ہے کہ علاوہ

کمر کے مزید کسی چیز کی گنجائش نہیں رہتی وہ زمانے لد گئے جب لیلیٰ کی کمر کے متعلق سوچنا پڑتا تھا کہ کہاں ہے کدھر ہے لیکن اجکل حضرت مجنوں کے بارے میں یہی گمان ہوتا ہے۔ حسن وجنون تو بے شک اپنی جگہ قائم ہے اور عاشق و معشوق فیشن کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں مگر کچھ جدت ضرور پیدا کی گئی ہے مثلاً فیشن کے سمندر میں بہتے ہوئے ساحل پر نہیں بلکہ فیشن ایبل ہوٹل کا رخ کرتے ہیں اور کوئی خوبصورت سا گیت ریڈیو پر سنتے ہیں دیکھئے میں بہک گئی۔ آخر ہوتا پرانے زمانے کی! ریڈیو نہیں بلکہ ہوٹل میں جیوک باکس ہوتا ہے اب اگر اسکی تفصیل بتانے بیٹھ جاؤں تو ڈر ہے خط کی طوالت سے آپ اکتا نہ جائیں! اتنا جان لیجئے کہ یہ سائنس کا ایک کرشمہ اور کما نے کا انوکھا طریقہ ہے بس ۲۵ پیسے ۔۔۔ افوہ بھئی آپ کے جانے کے بعد یہ کیسی تبدیلیاں ہوگئیں اب آپ بحث کرینگے کہ یہ ۲۵ پیسے کا کیا تک ہے قبلہ اپکے زمانے میں دو اور دو چار ہوا کرتے تھے لیکن ہمارے زمانے میں تو حساب ایک ہی ایک کا ہوتا ہے اب آنے والے رخصت ہوکر پیسوں پر بات آگئی ہے "اب تو ۱۶ آنے بات پکی" والا محاورہ بھی ناقابل استعمال ہوگیا ہے ہاں تو بس اس ڈبے میں ۲۵ پیسے ڈالئے اور پسند کا ریکارڈ سنئے بس یہی ہمارے زمانے کے لیلیٰ مجنوں کرتے ہیں گیت کے دوران ناز نخرے بھی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تیر نظر سے گھائل ہونے کے بجائے پستول چل جاتے ہیں اور ریکارڈ چلتا رہتا ہے آج رسوا تیری گلیوں میں محبت ہوگی۔ ویسے جیوک باکس کا فیشن بھی ختم ہوگیا اب ٹی وی چلا کرتا ہے ارے نہیں صاحب خدا نہ کرے ٹی بی نہیں بلکہ یہ بائسکوپ کا ڈبہ ہے اور بجائے اندھیرے کے روشنی میں دیکھا جاتا ہے گھر گھر نظر نہ آئیگا اب تو جس گھر میں ٹی وی نہ ہو شرفاء میں شمار نہیں کیا جاتا شرفاء کی پہچان بدل گئی ہے۔

اب چھوڑیے بھی اس بحث کو!! اکبر صاحب اپکے وقتوں کے لوگ بڑے بھولے تھے بی اے یا گریجوٹ ہوجانا گویا معراج تھی لیکن ہمارے دور میں گریجوٹ بوٹ پالش کرتا ہے رکشا چلاتا ہے یا پھر بے روزگاری سے تنگ اکر خود کشی کر لیتا ہے۔ اکثر اس آرٹ سے ناواقفیت کی بناء پر اقدام خودکشی کے جرم میں دھر لئے جاتے ہیں ویسے یہ بھی برا نہیں گورنمنٹ ہاؤس میں کھانا مل ہی جاتا ہوگا ۔۔۔!

یہ لیجئے اکبر صاحب کمال کر دیا آپ نے اٹینک ٹیبل اور کرسیوں کے چکر میں ہیں کسی
معصومیت سے فرماتے ہیں۔

طریق مغربی سے ٹیبل آئی کرسیاں آئیں ۔۔۔ دلوں میں ولولے اٹھے ہوس میں گرمیاں آئیں۔

اطلاعاً عرض ہے کہ ہنر اور عیب نے اپنی کرسیاں بدل لی ہیں یعنی عیب ہی ہنر کہلانے
لگے ہیں آپ نے بھلا کاہے کو سوچا ہوگا کہ ایکدن وہ آئے گا جب اچھے خاصے معزز لوگ
ہاتھ پر روٹی دھرے کھاتے نظر آئینگے لیکن سچ تو یہ ہے کہ انسان آسان پسند ہوتا جارہا ہے
دعوت کا اہتمام بس اتنا کہ ایک میز بچھائی اس پر کھانا چن دیا رکابیوں کا ڈھیر لگادیا
کھڑے کھڑے رکابی پکڑ لی اور کھانے میں مصروف ہو گئے طریق مغربی سے جو میز کرسیاں
آئی تھیں اب اس میں گھن لگ رہا ہے بات یہ ہے لوگ اصول وصول کے قائل نہیں رہے
لیکر کے فقیر صرف محاورہ رہ گیا۔ ہاں یہ جو نیا طریقہ کھانے کا ایجاد ہوا ہے اس کا نام ہے بوفے
آپ ہی کی طرح میں بھی سوچتی ہوں کہ بوفے جیسا بدمزہ لفظ دعوت سے کیسے جڑ گیا؟ یہ جو ولولے
اور ہوس والی بات ہے نا اب اسکی اہمیت ختم ہو گئی ہے آپ لوگوں نے بلاوجہ شرافت'
عزت آبرو اور اسی قوم کی نہ جانے کیا باتیں زبردستی اپنے پر لاد رکھی یقین ظاہر ہے جب
اپنے ہاتھوں ہی آپ لوگ مجبور تھے تو ولولے اور ہوس تو سر اٹھاتے ہی۔ معاف کیجئے گا
آپ لوگ تھے بھی بڑے جذباتی۔ موجودہ دور میں جذبات کا نہیں عمل کا ہے ایک لفظ ہے practical
پریکٹیکل اس دور میں اسی کا رواج ہے۔!

اکبر صاحب اپکی ایک بات تو سونے میں تلنے کے لائق ہے یعنی آپ کھری کھری کہتے
ہوئے بھی انداز ایسا رکھتے تھے جیسے کہہ رہے ہوں "قبلہ میں تو مذاق کر رہا تھا" اس تمہید سے
مطلب ہے کہ جب آپ صاف بات کہہ سکتے ہیں تو یعنی سچ برداشت بھی کر سکتے ہونگے
گستاخی معاف یہ جو عورت کی تعلیم پر آپ نے جگہ جگہ چوٹ کی ہے یہ کچھ اچھا نہیں کیا اپنی
جنس کو دیکھئے اسکی اصلاح کرتے کیئے ہمارے راستے میں کانٹے بونے سے آپ کو کیا ملا کبھی
تو آپ کہتے ہیں۔

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم ــــ قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

برا نہ مانئے گا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو منہ میں آیا کہہ گئے بغیر سوچے سمجھے۔ شوہر و اطفال کو آپ نے قوم سے الگ کر دیا کیا پوچھ سکتی ہوں کہ قوم کیا انڈے سے نکلتی ہے؟ انڈے سے برآمد ہوتی ہے تو انتہا کر دی آپ نے !!؟ یہ تو اندھیر ہے سچ مچ !! واہ جناب واہ۔ !دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں ــ ! کمال ہے آگے فرماتے ہیں ۔

ان سے بیوی نے فقط اسکول ہی کی بات کی ــ یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

"یہ ان" آخر کون ہیں آپ کو ان سے کیا مطلب ۔ پہلی بات تو یہ کہ اپکو اس طرح میاں بیوی کی گفتگو چھپ کر سننا ہی نہ چاہیئے تھا ۔ خدا جانے انھوں نے کیا کہا اور آپ کیا سمجھے آپ کو تو بہانا چاہیئے ۔ جب چھپ کر بات سن ہی رہے تھے تو پوری بات سنی ہوتی ممکن ہے اسکول کی بات ختم کر کے بیوی رات کی باسی روٹی کے بجائے تازہ روٹی سامنے رکھتی ! اسکول پر گفتگو کرنے والی ظاہر ہے کہ سلیقہ مند اور شوہر پرست ہی ہوگی بھلا رات کی روٹی کیوں دیتی ۔ لیکن آپ تو بس ! کیا کہوں جانے دیجئے ۔

اب یہی دیکھ لیجئے کالج کی عمارت بھی اپکی آنکھ میں کھٹکتی ہے بعض اللہ ہے اپکو بجائے مبارکباد دینے کے بس کہدیا ۔

کالج بنا عمارت فخر النساء بنی ــــ شکر خدا کہ مل گئے آخر بنا بنی

ارے صاحب شکر ادا کیجئے کہ کالج کی بدولت بیٹی کے لئے بر اور بیٹے کے لئے لڑکی کی تلاش کرنے کی زحمت سے والدین بچ گئے ۔ آپ لوگوں کی پسند سے شادیاں کر کے اکبر صاحب ہم نے بہت پاپڑ بیلے ہیں ۔ اور یہ تو اپکی سراسر زبردستی ہے جو ایسی بات کہتے ہیں ۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی ــ اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی ۔

قبلہ ذرا یہ تو بتلایئے کہ عورت کب شمع انجمن نہ تھی اجی جناب وہ تو اپنی ذات میں انجمن اور صفات میں شمع ہے قصور انگلش کا نہیں اپکی سوچ کا ہے اور سوچ پیدا ہوتی ہے فطرت اور ماحول سے ! ہاں ذرا یہ تو بتایئے اپکے ہے سے جب عورت چراغ خانہ تھی تو کونسی

قدر کی آپ نے اسوقت شمع انجمن کی جستجو میں بازار حسن کے چکر کون اور کیوں کئے گئے۔ ہو گئے نا لاجواب اُنکو ہم جیسے جیسوں سے واسطے ہی نہ پڑا ورنہ ساری شاعری دھری رہ جاتی۔

ایک بات پوچھوں؟ بُرا تو نہ مانئے گا کیونکہ ذرا دکھتی رگ ہے انگلی پڑے گی تو دکھے گی ضرور۔

ویسے مجھے آپکی طرح لوگوں کے گھروں میں جھانکنے کا شوق نہیں ہے۔ اور نجی زندگی پر سوال کرنے کا حق بھی نہیں۔ مگر کیا کروں ایسی بات سنی ہے کہ یقین کرنے کو دل تو نہیں چاہتا لیکن عورت کے متعلق آپکے خیالات شبہ کی گنجائش بھی نہیں چھوڑتے۔

بات یہ ہے اکبر صاحب ایک صاحب نے لکھا ہے کہ آپ نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ آپکی ہم خیال نہ تھی ان سے ایک بیٹا بھی تھا دونوں نے بڑی مصیبتیں اٹھائیں اور آپ ایسے کٹھور بنے رہے کہ بستر مرگ پر پڑا بیٹا آپکے لئے ترستا رہا اور آپ نے اسکو الوداع بھی نہ کہا کیا یہ سچ ہے اگر یہ حقیقت ہے تو پھر تو اپنے کو آپ اور دوسرے کو تو" والا معاملہ ہو گیا نا بھئی اپنے لئے تو آپ پڑھی لکھی بیوی چاہتے ہیں اور دوسروں کو مشورہ ہے کہ دیکھو اسکول کی پڑھی لڑکی گھر میں نہ لانا واہ کیا انصاف ہے صاحب۔ ایک طرف لڑکیوں کو علم سے دور رکھنے کی پوری کوشش اور خود معصوم سی بیوی کو نباہ بھی نہ سکے!! اکبر صاحب یہ آپکی زندگی کا بڑا تاریک پہلو ہے ہو سکتا تھا کہ جس کالج کو آپ فخر الدین کہتے ہیں اگر اس غریب نے وہاں تعلیم پائی ہوتی تو وہ خود سوچ سمجھکر شادی کا فیصلہ کرتی۔ آپ کی زندگی کے اس پہلو کو دیکھنے کے بعد واقعی آپکی صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔!!

اور آپکا یہ کہنا سراسر غلط ہے

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر ——— شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی

یہ خرابی تعلیم سے نہیں مرد سے پیدا ہوتی ہے غلامانہ ذہنیت کی پیداوار ہے آپکی یہ سوچ۔!! آپ نے تو خود ہی اعتراف کر لیا کہ خلاف شرع کبھی تھوکتا بھی نہیں ——— اندھیرے اُجالے کبھی چوکتا بھی نہیں ——— تو ہمیں کس منہ سے کہتے ہیں سچ اکبر صاحب آپنے ہمیں بہت

بدنام کیا ہے لیکن پھر بھی ہم انکی عزت کرتے ہیں کیوں اسکا جواب آپکے یہ دو شعر ہیں۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں ـــ اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپکا پردہ کدھر گیا ـــ کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

آخری مصرعہ تو غضب کا ہے آپکا سارا کلام ایک طرف اور یہ چار مصرعے ایک طرف۔
یعنی آپ چند بیبیوں کو دیکھکر زمین میں گڑ گئے۔ نہیں صاحب اس گڑنے میں کچھ گڑ بڑ ہے۔
یہ غیرت قومی نہیں ہے کچھ دال میں کالا ضرور ہے خیر میں اپنے منہ سے کیا کہوں ہماری صدی میں تو
بیبیوں اور بیویوں کے غول کے غول نظر آتے ہیں اور سب خیریت رہتی ہے آپ ہیں کہ
چند بیبیوں کو دیکھکر بوکھلا گئے۔ یہ غول دیکھتے تو یقینی کوئی زبردست حادثہ ہو جاتا یعنی
اسکوٹر وغیرہ کی زد میں آجاتے یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے اپنے اطمینان کی خاطر پوچھ ہی لیا
کہ پردہ کدھر گیا۔ بیبیوں کا جواب تو لاجواب ہے۔ "عقل پہ مردوں کی پڑ گیا" یہ تو مردوں کی
جب تاریخ لکھی جائیگی تو انکی صفات کے باب میں یہ مصرعہ سنہری حرف سے لکھا جائیگا

میرا خیال ہے اب رخصت ہونا چاہیئے۔ امید ہے زمانے کا رنگ آپکی سمجھ میں آگیا ہوگا۔
بس یہ ہے ہمارا زمانہ اور ہمارا ماحول لکھنے کو تو بہت کچھ ہے اس دور میں بھی آپ جیسی ہستیاں
موجود ہیں جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہماری طرف دیکھتی ہیں لیکن کچھ سمجھ نہیں پاتیں۔ نظریں
حیران چہرے پریشان اتنی بڑی دنیا میں اپنے کو تنہا پاتے ہیں اس حساب سے تو اچھا ہی ہوا
اکبر صاحب کہ آپ اس دور میں نہ رہے ورنہ قیامت کا سامنا ہوتا۔!

خط کا لہجہ بے تکلفانہ ہو گیا ہے اگر کوئی گستاخی ہو گئی تو یہ سمجھ کر درگذر کر دیجئے گا۔
کہ آخر بیسویں صدی کی کھیپ ہے اور اکیسویں کے دہانے پر کھڑی ہے اس سے اور امید بھی
کیا رکھتے۔ اپنے تمام ساتھیوں کو سلام پہونچائیے جواب سے تو مایوسی ہے لیکن شاید روز
حشر بالمشافہ گفتگو کا موقعہ مل جائے۔ خدا حافظ۔

شاعر کے خواب اور تصوّرات

عرفِ عام میں شاعر کی تعریف کچھ یوں ہے کہ شاعر اس کو کہتے ہیں جو شعر کہے لیکن میری
ناچیز رائے یہ ہے کہ جن و بشر کے درمیان بھی ایک مخلوق ہے جسکو شاعر کہتے ہیں!
آپ کوئی بحث کرنے پر ہی تل جانے لگے صاحب! کسی آسمانی کتاب میں ایسی
مخلوق کا ذکر نہیں ہے۔ آخر آپ نے کس بنا پر اس کو مخلوق جانا؟ تو میں دست بستہ عرض
کروں گی کہ قبلہ اجی اللہ پاک نے کائنات کی بہت سی چیزوں کو پوشیدہ رکھا ہے
ہو سکتا ہے کہ "مخلوق شاعر" کا ذکر بھی مصلحتاً نہ کیا ہو اور یہ بھی کوئی راز ہو!!
جہاں تک ظاہری شکل و صورت کا تعلق ہے بھلا ان کے انسان ہونے سے کس
کو انکار ہو سکتا ہے لیکن ان کی شاعرانہ فطرت اور مزاج معاذ اللہ! یہی وہ مقام
ہے جہاں سے حضرت شاعر جن و بشر کی درمیانی زنجیر نظر آتے ہیں مزاج کا تو یہ عالم
ہے کہ ذرا میں تولہ ذرا میں ماشہ ..... کسی کل قرار نہیں کسی بات میں اعتدال نہیں
تعریف کرنے پر آئیں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں ہجو پر اتر آئیں تو ساری دنیا
پر تھکوا دیں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ان کا دخل نہ ہو۔ رہا فن سو شاعر
خود کہتا ہے کہ "ہر فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا" عاشقی کا کیا کہنا یہ تو ان کا اوڑھنا
بچھونا ٹھہرا غرض انکی دنیا خواب و خیال کی دنیا ہے اور اس دنیا میں جو کچھ ہے تصوّر
ہے۔ یہ تصوّرات کی بنیاد پر ایسے ایسے محل تعمیر کرتے ہیں کہ انگشت بدنداں
رہ جایئے۔ خواب کون نہیں دیکھتا؟ ہوائی قلعے بھی لوگ تعمیر کر ہی لیتے ہیں لیکن
شاعر کا کیا مقابلہ یہ تو تصوّرات کو الفاظ کا کچھ ایسا جامہ پہناتا ہے۔ جو کبھی آپ کے
حاشیۂ خیال میں نہ آیا ہوگا۔ دور کیوں جایئے حکیم مومن خان مومنؔ ہی کو لیجئے

جی ہاں وہی مومن خاں جو آخری عمر میں مسلمان ہوتے ہوتے رہ گئے اور محض اتنی سی بات پر کہ ساری عمر بت پرستی کرتے رہے مسلمان ... ہونے میں کچھ فائدہ نہ دیکھا بات یہ ہے کہ مومن صاحب حکیم ہی نہیں نجومی بھی تھے حکمت سے صحت کا حال اور نجوم سے عمر کا حساب لگالیا ہوگا جب ہی تو مسلمان ہونے کا خیال ترک کر دیا ورنہ اگر کچھ اور عمر کٹنا ہوتی تو بس سمجھیے مسلمان ہو ہی گئے تھے! دیکھئے میں کوئی نئی بات نہیں بتا رہی ہوں یہ راز خود مومن خاں بتا گئے ہیں آپ بھی سن لیجئے تاکہ مجھ پر کوئی الزام نہ رہے کہتے ہیں ؎

"عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن، آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے"

حضرت مومن بھی آخر عالم خواب وخیال کے باسی ہیں سیدھی اور صاف بات بھلا کاہے کو کرتے جو بات ہے ایک معمہ ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا! خیر صرف معمہ ہی ہوتا تو صبر آجاتا بیٹھے حل کیا کرتے لیکن یہ شاعر تو مجموعۂ اضداد ہوتے ہیں انکی کسی بات کا ٹھکانا نہیں خود ہی ایک خیال پیش کر کے تائید کرینگے اور دوسرے ہی لمحے، تردید فرما دیں گے۔ ان کی کس بات کو مانیں کس بات کو نہ مانیں یہ فیصلہ کرنا ہی مشکل ہے ذرا یہ معمہ نما شعر ملاحظہ فرمائیے کہتے ہیں ؎

تھے بے گناہ جرأت پابوس تھی ضرور
کیا کرتے وہم خجلت جلاّد آگیا

یہ بھی کوئی بات ہوئی نا معمہ والی بات!؟ ارے صاحب جب آپ بے گناہ تھے تو جلاّد صاحب کیوں نازل ہوئے؟ اور کس کے قدم چومنے کی ضرورت پیش آئی اور پھر یہ "وہم" کیا بات ہوئی بھئی ہم تو ایک ہی "وہم" سمجھتے ہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہ تھا گویا حکیم صاحب نے الفاظ کا معجون مرکب تیار کیا ہے اس کی تاثیر بعد استعمال ہی ظاہر ہوگی ..... ہماری سمجھ میں تو اتنا ہی آتا ہے کہ محبوب صاحب جلاّد کے بھیس میں میاں عاشق کو قتل

کرنا چاہتے تھے اور عاشق صاحب کو قتل ہونا گوارہ نہ تھا انھوں نے سوچا چلو جلاد کہ پاؤں چوم کر کم از کم گستاخی ہی کر لو تاکہ دل کو یہ تسلّی رہے کہ بے گناہ قتل نہیں ہوئے اور اگر جلّاد سے باز پرس ہو تو وہ بھی صفائی پیش کر سکے کہ اس نے گستاخی کے جرم میں قتل کیا ہے ورنہ سچ پوچھئے تو ہم نے کبھی اس قسم کی انوکھی واردات ہی نہیں سنی! اب ذرا یہ ادا ملاحظہ فرمائیے۔

فرماتے ہیں ؎ کس صنم سے چھڑا دیا واعظ

لے خدا تجھ سے انتقام میرا

صرف باتیں بنا رہے ہیں ورنہ ان کو دیکھئے اور صنم کو چھوڑنا دیکھئے۔ کھسیائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں! ضرور صنم ہی نے چھوڑ دیا ہوگا کسی پر بس نہ چلا تو لگے گود پھیلا پھیلا کر واعظ کو کوسنے! اکہ جیسا واعظ نے میرا خرابہ کیا خدا اس کے آگے لائے ظاہر ہے کہ واعظ کی ساری عبادت کا حاصل حوریں ہی تو ہیں! کون جانے کہاں تک اس خیال میں صداقت ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ شاعر کی باتیں تمام خواب و خیال کے قصے ہیں۔ ورنہ کہاں کا صنم اور کیسا واعظ جو جی میں آیا فرض کر لیا اور لگے واویلا کرنے!

کدھر شاعری اور کدھر نجوم مگر مومن خاں نجوم کو بھی یوں کھینچ لائے جیسے یہ بھی شاعری کا لوازمہ ہو! کہتے ہیں:

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس

آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا؟

فن نجوم کو ذریعہ معاش بناتے تو چین کی بنسی بجاتے! لیکن شاعر تو اپنے تخیلات کے ہاتھوں تباہ ہے۔ جس طرح ان کے یہاں واعظ، ناصح، رقیب، اور محبوب وغیرہ خیالی ستم گر ہیں اسی طرح ان کو یہ بھی خیال ہے کہ خواہ آسمان سے کتنی ہی رحمتیں نازل ہوں، ان کے حق میں وہ ستم ہی ثابت ہوتی ہیں۔ اب اس خیال کو اکے

دل سے کون نکال سکتا ہے۔ کوئی حضرت مومن سے ذرا یہ پوچھے کہ جب آپ کا نجوم ہی اس کی بدنصیبی کی گواہی دے رہا ہے تو بلاوجہ غریب آسمان کو کیوں بیچ میں لاتے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ پوچھے کون! ایک جگہ فرماتے ہیں:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

خدا جانے کس ترنگ کی جون میں تھے کہ ایسا صاف شعر کہہ دیا۔ اگر کسی نے اردو کی دو چار کتابیں پڑھیں اور جاسوسی ناولوں کا مطالعہ کر لیا تو سمجھے کہ بیڑا پار ہے۔ اگر آپ اس سے اس شعر کا مطلب پوچھیں تو وہ فوراً تشریح کریگا کہ حضرت مومن نے گویا کا لفظ عادتاً لکھ دیا ہے، کیونکہ یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔ ورنہ شاعر اپنے ایک مخلص دوست سے کہتا ہے کہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں یعنی گھر والے باہر چلے جاتے ہیں تو آپ میری تنہائی دور کرنے کیلئے آ بیٹھتے ہیں۔

یوں تو مومن کیا کہنا چاہتے ہیں اس کی بحث بے کار ہے ظاہر ہے کہ کوئی خواب بیان کیا ہوگا، یا تصور میں محبوب کو قریب پایا ہوگا ورنہ اگر سچا عشق ہوتا تو عاشق ہرگز یہ نہ کہتا کہ "صاحب میں ایسا نکما عاشق تو ہوں نہیں کہ بس سارے کاروبار کو ایک طرف کر کے آپ کے دھیان میں رہوں۔ آخر مجھے بھی دوسرے کام ہیں۔ ملنا جلنا بھی چلتا ہی رہتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب دوسرے مشاغل سے فرصت پاتا ہوں اور آپ کا دھیان آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ میرے قریب ہی موجود ہیں۔" ذرا غور کیجئے "جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا" کہہ کر محبوب کی کس قدر ہتک کی ہے۔ بہرحال ہم کو ان معاملات سے کیا غرض اب حضرت مومن کا ایک شعر اور پیش خدمت ہوگی ذرا توجہ سے سنیے فرماتے ہیں ۔

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہونگے

خدا جانے مومن خاں کے تصور میں کیا ہے کہ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مخاطب کون ہے نہ ہی خواب عدم کی بات کھلتی ہے پھر ہم جیسے لوگ جو مادی چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں بھلا ان کا شعر کیا پلّے پڑے گا ہماری سمجھ میں جو بات آئی اس کا خلاصہ بیان کرتی ہوں۔

ہوا یہ کہ مومن مرض موت میں مبتلا ہو گئے جینے کی آس نہ رہی سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ آپ نجومی بھی تھے اختر شماری سے یہ اندازہ کر لیا کہ کل لیجئے آنے والا کل زندگی کا آخری دن ہے۔ طبیعت دور اندیش پائی تھی خیال آیا کہ میرے بعد "بوا شب ہجراں" کا کیا ہوگا ساری عمر تو میری خدمت میں گزار دی اور بڑی وفاداری سے میرا ساتھ دیا۔ اس کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے بس یہ خیال آتے ہی بوا کو سامنے بلا کر ان کا حساب کتاب بے باق کیا ہاتھ پر تنخواہ دھری اور نہایت مخلصانہ اور دوستانہ مشورہ دیا کہ وہ کوئی گھر دیکھ لے تاکہ گذر بسر کے لئے بعد میں پریشانی نہ اٹھانی پڑے"۔

اب اگر اصل مطلب پر آیئے تو وہی خواب وخیال والی بات ہو جائے گی، کیوں کہ ظاہر ہے کہ "شب ہجراں" انساں تو کیا کسی مادی شکل میں بھی موجود نہیں اس کے لئے "ٹھکانے" کا مشورہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں لیکن بہر حال یہ شاعر اپنی دنیا کی بات کرتے ہیں اگر ہم ان کی زبان نہ سمجھیں تو بیچارے شاعر کا کیا قصور!

یہ تو تھے حضرت مومن اب ذرا چچا غالب سے ملاقات کیجئے۔ یہ دونوں ہم عصر تھے ایک آب وہوا سے ان کا خمیر تیار ہوا ہے اس لئے خواب وخیال کی بلندی میں غضب کی یکسانیت ہے وہی معمہ وہی پہلیاں یہاں بھی موجود ہیں۔ مزاج کا وہی عالم ہے۔ خود داری پر اتر آئیں تو دنیا ٹھوکر میں آجائے بے اختیار ہوں تو ایسے جیسے لفظ "ضمیر" ان کی لغت میں کبھی تھا ہی نہیں بات کا بتنگڑ بنانے میں بھی اپنی مثال آپ ہیں ان کی روز مرہ زندگی اور اشعار کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ غالب صاحب کے اشعار کچھ شرط بھی چاہتے ہیں۔ مثلاً جب آپ شعر پڑھیں تو وہ کیفیت بھی اپنے پر طاری کیجئے جو چچا جان بیان فرماتے ہیں۔ جہاں

تک ہماری معلومات کا تعلق ہے چچا جان پر کبھی وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی جو اکثر وہ بیشتر ان کے اشعار میں پائی جاتی ہے مثلاً اس شعر کی کیفیت ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں:-

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ غالبؔ کے اجداد فن سپہ گری کے ماہر تھے لیکن جہاں تک مرزا صاحب کا تعلق ہے تیر تو چھوڑیئے شاید سوئی بھی نہ چھوئی ہو اور بات اتنی بڑی کہہ دی میرا خیال یہ ہے کہ اتفاق سے انگلی میں پھانس لگ گئی ہوگی اور جب تک نہ نکلی کھٹک ہوتی رہی ذرا تصور کی پرواز دیکھئے کہ ذرا سی پھانس نے تیر نیم کش کی شکل اختیار کر لی اور اس نے جگر میں خلش پیدا کر دی ورنہ آپ ہی انصاف سے کہئے کہ جگر میں تیر پیوست ہونے کے بعد کیا زخمی کو موت اتنی مہلت دیتی کہ وہ خلش سے لطف اندوز ہوتا؟ دیکھئے خدا نہ کرے میری نیت گستاخی کی نہیں بھلا میں اور ادب سے مذاق تو یہ! میں تو صرف ان تخیلات کی طرف اشارہ کر رہی ہوں جو شاعر کو رائی کا پہاڑ بنانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شاعر خواب نہ دیکھے تو زندگی کا مقصد ہی کیا رہ جائے۔ یہ شعر سنئے ارشاد ہوا ہے:

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

گویا جناب ساقی کے ساتھ نخرے فرما رہے ہیں۔ یہ اتنا نہ بنتے تو اچھا تھا! میخانہ وہ بھی اس شان کا کہ جس میں ساقی بھی ہو۔ پھر ایران کی بات ہندوستان میں اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے بزم مے کا اہتمام خاص ہند کی چیز ہو۔ اس پر اترانا دیکھئے ان سے کوئی پوچھے کہ بھلے آدمی جب توبہ کر چکے تھے تو میخانہ گئے ہی کیوں تھے گئے تھے تو ہنس بول کر آ جاتے یہ کیا زبردستی ہے کہ آپ توبہ کریں اور ساقی اصرار کرے کہ آپ کو ہماری جان کی قسم آج تو پینی ہی پڑے گی بھلا قرض کی

پینے والے میخانے میں کاہے کو گئے ہونگے لیکن وہی مثل ہوئی کہ جہنم سے ہوئے ہوئے اور سینے آبی کھاٹ ! نہ جانے زندگی میں کتنی بار پتہ بتانے کی نوبت آئی ہوگی لیکن ذرا غالب صاحب کو دیکھئے کس انداز سے پتہ بتا رہے ہیں کہتے ہیں:

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

اچھی خاصی پہیلی ہے پتہ بتاتے وقت قاعدہ تو یہ ہے کہ لوگ گلی یا سڑک کا نام اور پھر مکان نمبر وغیرہ بتاتے ہیں آپ کو دیکھئے فتراک اور نخچیر کی بات شروع کر دی اب ان کے تصورات کو کوئی کہاں تک ٹٹولے اس کا مطلب غالب صاحب سمجھیں یا پھر ان کا خدا ورنہ ہو سکتا ہے کہ گھر کا پتہ نہ پوچھا ہو بلکہ یہ پوچھا ہو کہ حضرت آپ کی تعریف !! اور تعریف میں حضرت نے دست بستہ عرض کی کہ خاک تو وہی ہے جس پر آپ نے تیر اندازی کی مشق فرمائی تھی یہ کہنا مشکل ہے کہ گفتگو کس کے درمیان ...... ہوئی تھی ۔ قیاس کہتا ہے کہ عاشق و معشوق ہی ہونگے مختلف حضرات نے مرزا غالب کے حالات زندگی قلمبند کیئے ہیں جہاں تک خودداری اور نفاست پسندی کا تعلق ہے سب کا یہی خیال ہے کہ یہ خوبیاں محترم میں بدرجہ اتم موجود تھیں ۔ غالب صاحب کا قول تھا کہ جان جائے پر آن نہ جائے اس خیال کو شعر میں کچھ اس طرح واضح کرتے ہیں کہ :

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

جو کچھ آپ فرماتے ہیں بجا ہے کیونکہ ایک مرتبہ آپ ملازمت کیلئے اسکول گئے اور جب وہاں کا پرنسپل آپ کی پالکی تک استقبال کو نہ آیا تو آپ یہ کہہ کر الٹے پھر آئے کہ دو ایسی نوکری کو دور سے سلام جس میں بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں ! چنانچہ حضرت غالب کی بندگی میں بھی ایک آن بان ہے حج کی نیت

سے گئے مگر در کعبہ بند ملا تو اتنا گوارہ نہ کیا کنڈی کھٹکھٹا دیتے بلکہ بغیر فرض ادا کئے پلٹ آئے گستاخی معاف آپ کی نیت ہی صادق نہ ہوگی جو درِ کعبہ خود بخود نہ کھلا خیر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے اس میں ہم کو دخل دینے کا کیا حق ؟ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جناب کے اشعار سے خودداری کا بھرم ہر صورت کھل جاتا ہے یا تو خودداری کا یہ عالم کہ کعبہ سے پلٹ آئے یا جو بے اختیار ہوئے تو عجیب حرکت کر بیٹھے تیر ایسی حرکت کی بھی تو خاموش رہتے۔ جی نہیں بڑے فخر سے فرماتے ہیں:

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ باہر لگن کے پاؤں

بھلا بتلائیے انتہا ہو گئی خدا نخواستہ کہیں "سیم تن" پاؤں سے کوئی بیجا حرکت کر بیٹھتا تو کیسی بے عزتی ہوتی۔ افسوس نہ خودداری رہی نہ نفاست سب شاعری کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پھر بھی دل کو یہ تسلی ہے کہ یہ خواب و خیال کے باسی ہیں ان کے لئے سب جائز ہے۔

غریب شاعر کی جان کو سیکڑوں روگ ہیں اس کے باوجود اپنی دنیا سے باہر نہیں آتے رقابت اندیشۂ رشک اور حسد یہ ایسی بلائیں ہیں جو ان کی جان کو جونک کی طرح لپٹی ہوئی ہیں مثلاً کہتے ہیں:

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

خود ہی پہلی کہی اور بوجھی جب یہ بات فرض کر لی تو اب آتش رشک میں سلگ رہے ہیں۔ اگر سیم پیر ان کا خیال واضح ہو جاتا تو ضرور دلجوئی کی کوشش کرتے مگر، یہاں تو لفظ "یوں" کے چکر میں آ گئے۔ غالباً غالب صاحب یہ دعا کر رہے ہیں کہ محبوب شراب پی کر ان کے گھر آئے لیکن "پر نہ کرے خدا کہ یوں" کی بات پلے نہیں پڑتی دو لفظوں میں سے ایک بات ہے یا تو یہ کہ شراب پی کر نہ آئے

دوسری بات یہ کہ پی کر آئے لیکن رقیب ساتھ نہ ہو دیکھئے تو شاعر کس قدر خود غرض ہے آپ ہی سوچئے کہ شراب پی کر تنہا گھر سے نکلنا کس قدر خطرناک حرکت ہے۔ مستی کے عالم میں راستہ بھٹک جائے یا خدانہ کرے کوئی حادثہ پیش آجائے تو کس قدر پریشانی ہو ظاہر ہے ایسی صورت میں یاد فا ملازم تنہا کیوں نکلنے دیگا ضرور ساتھ ہو جائے گا لیکن حضرت شاعر اپنی رقابت کو کیا کریں کہ ادنیٰ ملازم پر بھی رقیب ہی کا گمان ہوتا ہے۔ اب غالب صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ محبوب بغیر پئے آئے تو ان سے کھل نہ سکے گا اور اگر پی کر آئے تو رقیب ضرور ساتھ ہوگا دیکھئے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ لیکن جناب یہ ہماری آپ کی دنیا تو ہے نہیں۔ یہ تو شاعر کی دنیا ہے وہاں کے آداب عاشقانہ کو ہم کیا سمجھیں! اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ خود شاعر بھی کبھی کبھی اپنی کہی نہیں سمجھتا خود غالب صاحب بھی اس بات کا اظہار ڈنکے کی چوٹ پر کر چکے ہیں۔ کہتے ہیں:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

یہ واقعہ ہے کہ خدا نے ان کی التجا سن لی۔ اگر غالب صاحب ہمارے درمیان ہوتے تو ہم ان سے کہتے کہ ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں اور چچا جان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ آپ کا جو جی چاہے کہتے رہئے ہم کچھ نہیں سمجھتے!!

(بشکریہ اے۔آئی۔آر حیدرآباد)

"سوکن"

نہیں صاحب! ناممکن اور قطعیٔ ناممکن!! ہماری انکی نہ کبھی بنی ہے نہ بنے گی یہ جھگڑا تو زندگی کے ساتھ ہے اگر ختم ہونے والا ہوتا تو کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔ ارمان رہ گیا کہ کبھی ہم سے سیدھے مُنہ بات کر لی ہوتی یا کم از کم ہماری طرف پیار سے دیکھ ہی لیا ہوتا وہاں تو یہ حال ہے کہ جب دیکھو مُنہ پھلائے روٹھی کھڑی ہیں۔ اگر کان میں بھنک بھی پڑ جائے کہ ہم نے میاں کے ساتھ کہیں جانے کا ارادہ کیا ہے تو پھر دیکھئے ہماری راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کے کیسے کیسے ڈھنگ اختیار کئے جاتے ہیں۔ خدا کی قسم ہر ایک کو دل میں بٹھاتی ہیں سُنی سُنائی نہیں اپنی آنکھوں سے ان کا پیار دیکھا ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ ہمکو دکھا دکھا کر پیار کیا جاتا ہے گویا ہمکو جلانے کے سامان کئے جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہیں ہم سامنے آجائیں تو پھر تماشا دیکھئے کلیجے میں ایسی آگ لگتی ہے کہ مُنہ سے دھواں اگلنے لگتی ہیں۔ جہاں کھڑی ہونگی چپک کر رہ جائینگی کیا مجال جو ایک قدم بھی ہماری طرف بڑھ جائیں اگر کوئی صلح صفائی کی کوشش کرے تو ایسا نمانچہ رسید کریں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے ان کے نخرے خدا کی پناہ!

یوں تو ہمارے شوہر نامدار ایک نہیں کئی لا تے اور لاتے ہی رہتے ہیں ارے صاحب یہ ان کا محبوب مشغلہ ہے یعنی کہ hobby ہابی ہے اب یہ گلا ہی بیکار ہے کہ وہ کیوں لاتے ہیں اور پھر انکی اس hobby سے ہمیں کبھی تکلیف بھی تو نہیں پہونچی ان آنے والیوں میں ایک سے ایک حسین بھی رہیں۔ جوان، ادھیڑ اور بوڑھی بھی شامل ہیں۔ غرض ان آنے والیوں میں ہر قسم اور ہر ذات کی آتی رہیں اور جاتی رہیں۔ انکے دنیا کے بھر کے چاؤ چونچلے ہوئے مگر کیا مجال کہ ہم سے چوں بھی کی ہو لہذا ہم اپنی جگہ مگن رہے۔ اور اب جو یہ پسُوڑتی صورت آئی

ہیں تو اللہ نے چاہا تو ایک نہ ایک دن ان کا بھی بوریا بستر سمٹ ہی جائیگا مگر کب یہ اللہ بہتر جانتا ہے!! غرض پہلی والیوں نے جیسا بھی خوش رکھا یہ کمبخت توڑ ثابت ہوئی اور غضب یہ ہوا کہ میاں کو جو حسن اسمیں نظر آیا وہ پہلے کسی میں نظر نہ آیا تھا۔ نگوڑی کی کچھ شکل بھی لئے ہوئے کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں رنگ و روغن تک ٹھکانے کا نہیں صورت یہ جیسے پھٹکار برس رہی ہو۔ آئے دن کی مریض ہر وقت کی رنگ رنگ کبھی آواز بیٹھ گئی تو کبھی کان پٹ ہو گئے۔ آگ لگے پیٹ کو جہنم کی آگ کسی طرح بجھتی ہی نہیں بس کھائے جاتی ہے دوا دارو میں میاں کا دیوالہ پٹا جاتا ہے دیکھنے والے اندر رہی اندر اس نیا ہی پر کڑھتے ہیں مگر بہر حال عشق تو اندھا ہوتا ہے میں تو کہتی ہوں کڑھنا ہی بیکار ہے۔ میاں کا عشق بھی چلتا پھرتا ہے کبھی نہ کبھی یہ بھی چلتی پھرتی نظر آئیگی قویٰ اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ ایک نہ ایک دن اپاہج ہو گھر بیٹھ ہی رہینگی۔

ائے ہے توبہ ہے میری تمہید میں ایسی گم ہوئی کہ یہ بتانا ہی یاد نہ رہا کہ آخر اشارہ کس طرف ہے توبہ توبہ میرے میاں کے متعلق کوئی ایسا ویسا خیال بھی دل میں نہ لائیگا۔ "ہمارے میاں ایک نہیں کئی لا چکے ہیں" تو کیا خدا نخواستہ آپ سمجھ رہے ہیں "بیویاں" جی نہیں، جناب عرض ہے کہ موٹر یعنی کار۔! ہمکو تو گنتی یاد نہیں دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ہم سال میں چار قسم کی موٹروں میں نظر آتے ہیں۔ نئی سے نئی کھٹارا سے کھٹارا بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی۔

ایک مرتبہ ایک لمبی چوڑی موٹر آئی دل میں خوب خوب منصوبے باندھے کہ اسمیں کس طرح بیٹھیں اور کس ادا سے اتر آئیں۔ لیکن اسمیں بیٹھ کر اترانے اور اکڑنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ہوا یوں کہ بڑی تیاری کے ساتھ اس میں بیٹھ کر عابدہ کو ڈھونڈ گئے اور اسی دن شام کو ہم نے ایک محترمہ سے سُنا کہ "صبح آپ کی موٹر نظر آئی تھی مگر آپ اس میں نہیں تھیں" اب یہ غضب نہیں تو کیا ہے "پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان" ایسی موٹر کی بڑائی کو

لے کر کیا کریں جیسی ہماری ہستی ہی گم ہو کر رہ جائے۔ اس موٹر کا نام میں نے گھسیٹ رکھا تھا۔ اس کے بعد جو موٹر آئی اس کے متعلق اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اسمیں ہم لوگ بیٹھتے نہیں تھے بلکہ ٹھونسے جاتے تھے۔ پھر ایک ایسی موٹر آئی جسکو سرے سے موٹر کہنا ہی زیادتی تھی کیونکہ یہ تعالیٰ اللہ کے نام اور وظیفوں کے زور پر چلتی رہی ایک دن یا عام کی تقریب اسکا پہیہ اس زور سے نکل کھا گا کہ آج تک پتہ نہ چلا کہ کدھر کو گیا۔ خدا جانے میاں کی کونسی نیکی کام آئی کہ موٹر فٹ پاتھ سے رگڑ کھا کر رک گئی ڈیڑھ سو روپئے میں وہیں کھڑے کھڑے ہراج کر کے گھر تشریف لے آئے۔ یہ ساری موٹریں بیچاریاں خواب و خیال ہو چکی ہیں اب ہمارے پاس نہیں ہیں لیکن انکی یادیں باقی ہیں اب جو ہمارے پاس موٹر صاحبہ ہیں انکی ادائیں دنیا سے نرالی ہیں میرے ساتھ تو وہ سوکنا پہ ہے کہ خدا کی پناہ اپنی مرضی چلانے پر تلی رہتی ہیں ان کی مرضی کے خلاف کوئی جگہ سے ہلا دے تو ہم جانیں۔!

اچھی خاصی عمر ہے مگر نخرے چھوکریوں جیسے ہی وہ تو کہئے ان کا جنم ولایت کا ہے کہ اتنی چل گیئں ورنہ نہ جانے کب کی کسی کباڑی کی دوکان میں ڈھیر نظر آتیں۔ انکو چلنے پر آمادہ کرنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے اور اگر اتفاق سے چل پڑیں تو پھر دیکھئے چلنے کا وہ ہنگامہ خیز انداز ہے کہ کچھ نہ پوچھئے اٹھلا کر ان کا قدم اٹھانا بھی غضب ہے چند قدم چلنے پر سارا کھایا پیا ہضم ہو کر بھوک پلٹ آتی ہے اور کبھی کبھی تو یہ اٹھلاتی چال معلوم ہوتا ہے کہ پیٹ کے سارے ساز و سامان کو دیواتی ہانڈی میں تبدیل کر کے رکھ دیگی۔ پھر چال تو جیسی کچھ ہے ہنگامہ وہ غضب کا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے کچھ ایسا ڈنکے کی چوٹ چلتی ہیں کہ میلوں آگے سے لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھنے اور راستے سے ہٹنے لگتے ہیں گویا ہارن کا کام بھی نکلتا ہے اور آوازیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں عرفش چرچوں سے لے کر ڈھر پڑ کھڑ تک سب ہی شامل ہیں۔ بیٹھنے والے کو یہ گمان رہتا ہے کہ وہ موٹر پر نہیں آتہ زدوں پر سوار ہے اس میں بیٹھ کر ساتھ سے بات کرنے کی کوشش کرنا بے سود ہے منہ سے کچھ نکلتا ہے سنائی کچھ دیتا ہے اس میں تو بس

اس طرح اچھلتے کودتے چلتے ہیں گویا بچے کے ہاتھ میں گیند اچھل رہی ہو پھر اچھل کود بھی وقتی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب ساکت ہو جائے ـــ!

رشید احمد صدیقی صاحب نے لکھا تھا کہ ان کی موٹر کی ہر چیز بجتی ہے سوائے ہارن کے اس معاملے میں ہماری موٹر دو ہاتھ آگے ہی ہے کیونکہ جہاں اس کی ہر چیز بجتی ہے وہیں اگر غلطی سے ہارن پہ ہاتھ پڑ جائے تو بس قیامت ہے معلوم ہوتا ہے صور پھونکا جا رہا ہے ہارن بند ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تاوقتیکہ گاڑی روک کر اس کی کان گوشی نہ کی جائے۔ بہرحال سوکن کو دیکھ کر خدا کی شان نظر آتی ہے ترچھی نظروں کی کیا تعریف کیجئے جب لائٹ کھولیے سڑکوں سے گزروں اونچی کبھی درختوں پر اور کبھی عمارتوں کی کمپاؤنڈ وال پر پڑ رہی ہے کیا مجال جو سڑک پر کچھ نظر آجائے چلانے والے کو تو بہر صورت ٹٹول ٹٹول کر ہی چلانا پڑتا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ چورلے ہے کے پولیس والے کی تشفی کی خاطر لائٹ کھول دی جاتی ہے۔

دل کی حالت بھی ایسی خاص اطمینان بخش نہیں ڈاکٹر تو علاج کر کے ہار چکے تھے مگر ایک دن ہمارے صاحبزادے نے غور و فکر کے بعد علاج دریافت ہی کر لیا آخر کس باپ کے بیٹے ہیں ذرا یہ عجیب و غریب علاج بھی ملاحظہ ہو کہ اب یہ ہوتا ہے کہ جہاں چلتے چلتے دھڑکنیں رکتی محسوس ہوئیں اور فوراً ہی سیدھے ہاتھ کا دروازہ کھولا اور پوری قوت سے دھڑ سے بند کیا لیجئے اکھڑی سانسیں پھر ہموار ہو گئیں۔ نقاہت کا یہ عالم ہے کہ تو بہ بھلی پیروں میں دم نہیں چال ٹھیری چھبیلی رستہ دیکھیں نہ گھر جنگل دیکھیں نہ گاؤں جہاں جی چاہا اکڑ کر کھڑی ہو گئیں معلوم یہ ہوا کہ پہیے کی ہوا نکل گئی اب بیٹھے سر پکڑ کر!! آئیں ایسی چھڑے چھانٹ کے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں خالتو اسٹفنی بھی غائب ہیں جیک ندارد کہ پہیہ نکال کر ہی درست کر لیا جاتا۔

غرض دنیا کی مصیبت جھیلنا پڑتی ہے مگر نظروں سے اوجھل کرنا میاں کے بس کی بات نہیں۔

کہتے ہیں اس میں ایک عدد ڈگی بھی ہے جو صدا بند دیکھی ایک مرتبہ ریل کا سفر درپیش تھا۔ بمشکل تمام ڈگی میں سامان لے کر اسٹیشن پہنچے یقین مانیے ڈگی کھولتے میں ایسے لگے کہ ٹرین

سامنے سے نکل گئی ۔ جو سوکنا پا اس نے میرے ساتھ روا رکھا کسی نے نہ رکھا تھا۔ میاں کی تو ظاہر ہے کہ نور نظر ٹھہریں مگر مجھ سے خدا جانے کہاں کا بیر ہے ۔ اگر دل ہی بھی میاں کے ساتھ موٹر میں بیٹھنے کا ارادہ کر یوں تو میرے ارادہ کا خمیازہ بے چارے میاں کو پیدل دفتر تک بھگتنا پڑتا ہے مگر کو وقت تو یہی ہے کہ اس دشمن کو جواب ڈھکی چھپی بھی نہیں رہی شوہر نامدار اتفاق کہتے ہیں مجھے تو بس ڈر ہی لگا رہتا ہے کل ہی کی تو بات ہے مجبور کر کے موٹر میں بٹھایا ہزار کہا کہ صاحب آپ کی موٹر سے ہمارے ستارے نہیں ملتے کیوں جان جوکھوں میں ڈالتے ہو مگر وہاں سنتا کون ہے بولے " بھئی بہتر یق چل رہی ہے ابھی تو بچوں کو اسکول پہونچا کر آیا ہوں اتنی جلدی کیا خراب ہو گی " خیر صاحب ہم یا نہ بیٹھ گئے اب جو سلف دباتے ہیں تو ایک فش کی آواز نکلی اور سناٹا ہو گیا ہارن پر ہاتھ رکھا تو وہ بھی دبی سی آواز نکال کر خاموش ہو گیا کہنے لگے " بھئی بیٹری ڈاؤن ہو گئی " میں نے کہا مہربان یہ ہمارے قدموں کی برکت ہے آپ بیٹری لیئے پھرتے ہیں میں کہتی ہوں تر دس بیرک ڈاؤن نہ ہو جائے " غرض سڑک کے چند چھوکروں اور گھر کے ملازمین کی مدد سے ڈھکیل کر بمشکل تمام اسٹارٹ ہوئی مجھے تھوڑی ہی دور پر تو جانا ہی تھا ابھی گیٹ میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ اسٹرینگ آگیا میاں کے ہاتھ میں !! گویا سوکن بالکل ہی بے لگام ہو گئیں مجبوراً جہاں پہونچے تھے موٹر چھوڑ میکانک کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ میں نے دبی زبان سے پوچھا کیا اس کو بھی اتفاق کہو گے " اس نے تو ایسے ایسے گل کھلائے ہیں کہ اگر وقت اجازت دیتا تو دفتر لکھ ڈالتی جب ستانے پر اتر آتی ہے تو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ میاں کے دوستوں اور بیویوں کے ساتھ پکنک کا پروگرام بنا کرتا کیا نہ کرتا۔ دو چار کو اس موٹر میں بھی بٹھانا ہی پڑا اللہ اللہ کر کے کار روانہ ہوئی راستے بھر دعا کرتی رہی کہ اللہ میاں لاج رکھ لیجو مگر کہاں شنوائی ہوتی دعا کے الفاظ پورے ادا بھی نہ ہوئے تھے کہ پٹرول پمپ پر پٹرول لینے رکے تو دنیا ہی کے ہو رہے ۔ سوکن نے چلنے سے صاف انکار کر دیا مجبوراً ٹھنڈے ٹھنڈے آئے تھے گرم گرم لیئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے شرم سے میری حالت خراب میں اپنے ہی کو مجرم سمجھ

رہی تھی کہ اگر میں نہ بیٹھتی تو شاید موٹر خراب نہ ہوتی۔ ستم ظریفی تو دیکھئے کہ ہمارے میاں اس کو بھی اتفاق کہتے ہیں۔ بہر حال انھیں عشق میں کچھ سجھائی نہیں دیتا اور یہاں دن رات کا یہ سابقہ زندگی اجیرن کئے ہوئے ہیں اگر سوکن سے چھٹکارا پانے کا کوئی ٹوٹکا عنایت کریں تو باعث تشکر ہوگا۔!

★★★

لطیفہ

کابل گئے مُغل (مغل) بن آئے پھر سے مور یسانی
آب آب کر مر گئے سرہانے دھرا رہا پانی

قصہ یوں ہے کہ ایک بنیا کمائی کیلئے کابل گیا وہاں فارسی سیکھی، گھر آیا تو بیمار پڑ گیا۔ نزع کی حالت میں پانی مانگا۔ چونکہ فارسی بولنے کی عادت تھی۔

بجائے پانی کے آب آب کہتا رہا:
گھر والے سمجھے نہیں اور وہ مر گیا، مرنے کے بعد تیمارداروں کو پتہ چلا کہ پانی کو آب کہتے ہیں، تب

یہ دوہا بنایا گیا..........

بن بلائے مہمان

عنوان تو آپ نے سن ہی لیا اب رہا اس پر اظہار خیال تو جناب یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے کیونکہ یہ خالص گھریلو معاملہ ہے اور آپ جانتی ہیں کہ صبح سے شام تک دس قسم کی باتیں ہوتی رہتی ہیں چند باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں جنکا تذکرہ چار کے بیچ میں بیٹھ کر کیا جاسکے ورنہ اکثر واقعات پر پردہ پڑا رہنے ہی میں اپنی عافیت ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ پردہ بھی محض دل کی تسلّی کے لئے ڈالا جاتا ہے یوں اسکی پائداری پر ہمکو تو شبہ ہے کیونکہ انسان وہ جانور ہے جسکے کان کتّے کی ناک کی طرح کام کرتے ہیں۔ جستجو اور کھوج انسان کی وہ خصوصیات ہیں جو اسکو حیوانوں میں ممتاز کرتی ہے اور بات کا بتنگڑ بنانے میں تو انسان کا ثانی نہیں۔ اب آپ اندازہ کرسکتی ہیں کہ گھریلو معاملات پر پردے کی کیا حقیقت ہے! کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ بات سے بات نکلتی ہے تو آیئے ماضی کے جھروکوں سے ذرا دبیز جھالردار پردے سرکا کر جھانکیں اور مہمان اور میزبان کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھیں۔

ایک وقت تھا کہ مہمان کا آنا باعث رحمت تصور کیا جاتا تھا۔ ہر وقت گھر مہمانوں سے بھرا رہتا کھانا پکواتے وقت آئے گئے کا خاص خیال رکھا جاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کھانے کے وقت کوئی آجائے اور کھانا کم پڑجائے گویا یہ بات طے شدہ تھی کہ مہمان آئے تو بغیر کھانا کھلائے نہ جائے۔ مہمان کی آؤ بھگت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہتا بن بلائے مہمان کی محض اس لئے خاطر مدارات ہوتی کہ اسکو یہ احساس نہ ہو کہ عین کھانے کے وقت آگیا ہے گھر کے چھوٹے بڑے سب ہی اسکو گھیرے رہتے اور طرح طرح سے خوشی کا اظہار کرتے بے وقت کے مہمان سے اکتاہٹ تو دور کی بات ہے اگر کسی روز مہمان بنا دستر خوان پر بیٹھتے تو کچھ کمی سی محسوس کرتے۔ غرض یوں مہمانداریوں اور میزبانیوں میں سرشار رہا کرتے نہ سینما کا خیال آتا نہ کلب کا تصور پیدا ہوتا سب ہی اپنے ماحول سے مگن تھے بلکہ مدہوش تھے کہ اچانک

آ گئے اب جو ذرا سنبھلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں تھما ہے جسکو ہم بڑے احترام کے ساتھ راشن کارڈ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کارڈ کے سائز کی مناسبت سے ہمارا رزق اترنے لگا۔ مودی خانے کی کوٹھیوں میں چوہے لوٹ لگانے لگے اناج کے تھیلے جنکو کبھی اپنے کوتاہی داماں پر شرمندہ ہونا پڑتا تھا غیر ضروری نظر آنے لگے غرض کارڈ کے ساتھ ساتھ باورچی خانے اور مودی خانے کی ہر چیز سکڑ کر رہ گئی راشن کا اناج گھر والوں ہی کو پورا پڑ جائے تو سمجھئے معجزہ ہو گیا غرض نوبت یہانتک پہونچی کہ نہ باسی بچے نہ کتّا کھائے۔ ان حالات میں اگر بن بلائے مہمان آتے رہیں تو سوچئے کہ بے چارے میزبان پر کیا گذرتی ہوگی شاید ہی کوئی گھر ہوگا جہاں ایسے مہمانوں نے دھاوے نہ کئے ہوں۔

اس نازک مسئلہ کو نہ چھیڑا جاتا تو اچھا تھا مگر کیا کیجئے کہ ہمکو باقاعدہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس عنوان پر اظہار خیال کریں نہ صرف یہ بلکہ ڈھنڈورا بھی پیٹیں یوں کھلے عام اظہار خیال کرنا ڈھنڈورا پیٹنے کے برابر ہے۔ بڑا خوف یہ ہے کہ میرے خیالات کا اثر میرے دوستوں پر کیا ہوگا۔ کہیں خفا ہو گئے اور آنا جانا ہی چھوڑ دیا تو میں کہیں کی نہ رہونگی بھلا دوست بنا بھی کوئی زندگی ہے؟ مضمون کیا سنانا ہے اچھی خاصی برائی مول لینا ہے۔

بہر حال جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ تو لیجئے آ گئی میں اپنے موضوع کی طرف کچھ تجربے ضروری ہیں لیکن آپ جانتی ہیں جب تک مبالغہ آمیزی نہ ہو بات میں مزہ کہاں؟!

بن بلائے مہمان ہر زمانے میں گذرے ہیں اور جبتک انسان گوشہ نشینی اختیار نہ کرے یہ آتے رہینگے، انکو تین حصوں میں بہ آسانی بانٹا جا سکتا ہے، "رحمت" "زحمت" اور "بلائے ناگہانی"۔ اسمیں قصور بن بلائے مہمان کا کبھی نہیں ہوتا بلکہ میزبان اپنی حماقتوں کا خمیازہ بھگتتا ہے۔ حماقتوں کے لفظ پر چونکئے نہیں! خوش اخلاقی، ملنساری، انکساری اور بے تکلّفی جنکو ہم انسان کے کردار کی اعلیٰ قدروں کا نام دیتے ہیں، دراصل یہ وہ حماقتیں ہیں جنکا جواب نہیں۔ یہی انسان کو لے ڈوبتی ہیں اور گھر گرہستی کے معاملے میں آپ دا جبی ہی دا جبی ہیں تو سمجھئے بیڑا غرق ہے۔ اور اتفاقات پر کسی کا بس ہے۔ اتفاق ہی سمجھئے کہ ماما دو دن کی رخصت پر ہے باورچی خانے سے پیار نہیں مارے باندھے کچھ برا بھلا پکا لیا باورچی

کھانے کے چکروں میں موڈ الگ خراب ہے۔ بمشکل تمام ناشتوں سے فارغ ہو کر دم لیا ہے، میاں اور بچے اپنے اپنے کاموں سے جا چکے ہیں یہ طے کر لیا کہ دوپہر کو صرف چائے سے کام چلا جائیگا اور شام کو چار بجے سے پہلے چولہے کے قریب بھی نہ پھٹکونگی کہ اچانک ملی جلی آوازیں سنائی دیتی ہیں "ارے بھئی بیگم صاحب ہیں"۔ دل زور سے دھڑکا ایک زبردست آرزو نے انگڑائی لی۔ ہائے کاش دو نوکر ہوتے تو آج کے دن باہر ہی باہر مہمان کو بیگم صاحب کی غیر موجودگی کی اطلاع دیکر رخصت کر دیا جاتا۔ بھلا بتائیے اس زمانے میں دوا کے لئے نوکر تلاش کریں تو نہ ملے ایک نوکر ہے وہی کب کم مقام شکر ہے۔

غرض آرزو تو دل میں گھٹ کر رہ گئی البتہ مہمان معہ بچوں کے گھر میں داخل ہوئیں۔ بڑی تجندہ پیشانی کے ساتھ انکو خوش آمدید کہا گویا یہ پہلی حماقت سرزد ہوئی! اسلام علیک سلیک کے بعد فرمائش ملاحظہ ہو "بھئی کچھ چائے وائے پلواؤ، بچوں کے لئے جوتے خریدنے نکلی تھی دُکان پر بہت دیر لگ گئی تمہاری طرح مجھے بھی ۱۱ بجے چائے نہ ملے تو طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے سوچا تمہارا گھر قریب ہے اس بہانے ملاقات بھی ہو جائیگی اور چائے بھی پی لی جائیگی؛

جی میں تو آیا کہوں کہ "دوستی کتھا میری سہیلی" مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکی سارا ارادہ دھرا رہ گیا جھک مار کر چولہے کا رخ کیا نہ صرف چائے بنی بلکہ پاپڑ بھی تلے گئے اس عرصہ میں اپنی حماقت یعنی خوش اخلاقی کا بھرم رکھنے کے لئے ہم مسلسل مسکرا رہے تھے شاید آئینہ دیکھتے تو معلوم ہوتا ہمارے چہرے پر مسکراہٹ تھی یا اپنی لسوری صورت کو مسکراہٹ کا نام دینے پر تلے ہوئے تھے۔

پروگرام بنانا جتنا آسان ہے روبہ عمل لانا اتنا ہی دشوار۔ ہفتہ میں ایک دن کلب جانے کا پروگرام رہتا ہے مگر قسم لے لیجئے کہ کبھی اس پر عمل کرنا نصیب ہوا ہو۔ میاں دورے پر گئے ہیں گھر کی تمام ذمہ داریوں سے نہایت پھرتی کے ساتھ فارغ ہوئی بچوں کو سنا دیا گیا "دیکھو میں کلب جا رہی ہوں شام کو لوٹونگی، چھوٹا اسکول سے آئے تو خیال رکھنا ان ہدایتوں کے بعد جلدی جلدی تیار ہوئی گھر پر ایک نظر ڈالی ہاتھ میں پرس لیکر کمرے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک بیگم صاحب وارد ہوتی ہیں۔ بھئی کہاں کی تیاری ہے امید کہ کوئی باہر کا پروگرام نہ ہوگا" حسب معمول دل بھر دھڑکا کمبخت کو ... حاشا ... [illegible]

پڑتی۔ بمشکل دل کو سنبھالا اپنے کو انکسار کے سانچے میں ڈھالا گویا پھر حماقت فرمائی۔ بڑی فراخدلی سے گویا ہوئے "آؤ آؤ بھئی ہم کہاں جاتے ہیں گھر کی مصروفیات فرصت ہی کب دیتی ہیں آنے جانے کی" ادھر سے ارشاد ہوتا "اللہ کا شکر ہے میں تو تیاری دیکھ کر ڈر ہی گئی تھی بھئی آج تو ہم تمہارے پاس دن گذارنے آئے ہیں" سوائے اسکے کہ آپکی ذرہ نوازی ہے ہم اور کہہ ہی کیا سکتے تھے۔

دوران گفتگو معلوم ہوتا کہ انکے شوہر بھی دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں بور ہو رہی تھیں ہمارے پاس دل بہلانے چلی آئیں اب خدا کی اس نیک بندی سے کون پوچھے کہ آپکی بوریت کی سزا ہمکو کس علت میں مل رہی ہے۔ کاش اطلاع کر کے آتیں تو ہم نہ صرف انکو دن گذارنے بلکہ کئی دن گذارنے کی دعوت دیدیتے کیونکہ آخر ہمارے شوہر بھی تو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔

تعطیل کا دن ہے کھانے پر بیٹھے ہیں تقریباً آدھا کھانا ہو چکا ہے کہ دستک کی آواز آتی ہے ایک بے تکلف دوست معہ بیوی کے نمودار ہوتے ہیں۔ مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ جواب ملتا ہے "یار کمال کرتے ہو تم نے تو بچوں کو مات کر دیا بھلا کوئی شریف آدمی اتنی جلدی کھانا کھاتا ہے!! اچھا صاحب چلئے آپ بہت شریف آدمی ہیں کھانا نہ کھائیے یہاں بیٹھ تو جائیے! دیکھا آپ نے حماقتوں کی انتہا ہے۔ دوست صاحب بیوی سمیت کھانے کی میز پر آبیٹھتے ہیں۔ چند منٹ گذرے ہونگے کہ ارشاد ہوتا ہے۔ "واہ دال تو شکل سے بڑی لذیز معلوم ہوتی ہے ضرور بھابی نے پکائی ہوگی"، کچھ وقفے سے یوں گویا ہوتے ہیں" بھئی آپکی ماما پھلکے تو بہت عمدہ بناتی ہے پھر اپنی بیگم سے مخاطب ہوتے ہیں، میں جو ہمیشہ جس قسم کے پھلکے چاہتا ہوں دیکھو میری مراد ایسے ہی پھلکوں سے ہوتی ہے۔ بھئی تم انکی ماما سے سیکھ ڈالو تو اچھے پھلکے تو کھانے کو ملیں۔

اب ان تبصروں کے بعد ظاہر ہے کان تو بند کرنے سے رہے مہمان کو کھانا کھانے پر مجبور کیا جاتا ہے پھر لیجئے ہم کہاں ہماری پلیٹ کہاں جاکر ماما کو پھلکوں کے لئے آٹا دیا اور ہدایت کی دال اور خشکہ کم پڑے تو اپنے لئے دوبارہ پکالے مگر خدا کے لئے اس میں سے بچانے کی کوشش نہ کرے غرض یوں، بن بلائے مہمان رحمتیں لاتے ہیں یا نہیں البتہ زحمتوں سے ضرور دو چار کر دیتے ہیں۔

بلائے اور بن بلائے کا نمایاں فرق یہ ہے کہ دعوت دیکر بلائے جانے والوں کا ایک وقت مقرر ہے لیکن بن بلائے مہمان دن کے کسی حصّے میں ٹپک سکتے ہیں، حتیٰ کہ بعض مارے بے تکلفی کے رات کو بھی آدھمکتے ہیں انکے یہاں صبح دوپہر شام اور رات کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ صبح کا وقت انتہائی مصروفیت کا ہوتا مگر میں حیران ہوں کہ اسوقت لوگ اپنے کاروبار چھوڑ کر کیسے چلے آتے ہیں جبکہ ہمکو نہ انکے ساتھ بیٹھنے کی مہلت ہوتی ہے نہ بات کرنے کی فرصت۔ دوپہر کو جب تمام کاموں سے فارغ ہوکر ایک عمدہ سی کتاب ہاتھ میں لیکر لیٹتی ہیں اور جب کتاب کا انتہائی دلچسپ حصّہ آپکی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے کہ اچانک مہمان کی آواز آپکے کانوں میں گونج اٹھتی ہے جس پر آواز سے زیادہ بم کے دھماکے کا گمان گذرتا ہے۔ شام کو کسی بیمار کی عیادت کو آپ گھر سے باہر نکل رہی ہیں کہ ایک مہمان نازل ہوتا اور کچھ اس طرح جم کر بیٹھتا کہ آپ کو خود اپنے بیمار ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

رات کے دس بج چکے ہیں شب خوابی کے لباس میں آرام سے اپنے اپنے پلنگوں پر لیٹے دن بھر کے مختلف واقعات یا پھر حالاتِ حاضرہ پر تبصرے ہو رہے ہیں کبھی کبھی ادبی گفتگو میں محو ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عدد مہمان نازل ہوا ہے ذرا غور کا مقام ہے کہ اس حادثے سے آپ پر کیا گذرتی ہوگی۔ صبح اٹھکر جو مراحل سے آپ گذر چکی ہیں اسکو پھر دوہرائیے یعنی کپڑے تبدیل کیجئے کنگھی کیجئے اس اچانک حملے سے جو آپکے چہرے پر تاثر پیدا ہوا تھا اسکو دور کیجئے ان تمام حماقتوں کو جنکو ہم مہمان نواز اور خوش اخلاقی جیسے نام دیتے ہیں اپنے اوپر طاری کیجئے۔ اور مجسم اخلاق بنکر مہمان کی پذیرائی فرمائیے۔

غرض کہاں تک لکھا جائے ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے تو کیوں نہ راضی بہ رضا رہے۔

سچ پوچھئے تو اس بھاگم بھاگ کے زمانے میں کسکو اتنا ہوش ہے کہ کہیں جانے سے پہلے باقاعدہ پروگرام بنائے اور وقت مقرر کر کے جائے اب تو یہ حال ہے کہ کشمکش حیات سے ایک لمحہ کی بھی فرصت ملتی ہے تو جی چاہتا ہے عزیزوں اور دوستوں کے درمیان گذار دیا جائے اور یوں گھڑی بھر کی ملاقات کو ترسنے والے وقت اور تاریخ کی پرواہ کئے بغیر ملاقات کو نکل کھڑے ہوتے ہیں اگر ان ملاقاتوں کو بن بلائے مہمان کا نام دیا جائے تو سراسر زیادتی ہوگی۔

اتنا لکھنے کے بعد بھی میں کہونگی کہ مہمان بہرحال مہمان ہے جو اپنے ساتھ رحمتیں لاتا ہے اور یہ میرا ایمان ہے بن

[illegible]

انھیں شکایت ہے

سلیقہ مندی کی تعریف ہم بچپن سے کچھ یوں سنتے آئے تھے کہ جس عورت کو میاں کی کمائی سلیقے سے خرچ کرنا آئے، بچوں کی تربیت میں دلچسپی لے اور سوئی اور ڈوئی دونوں کا صحیح استعمال آتا ہو وہ سلیقہ مند کہلانے کی مستحق ہے۔

چنانچہ شادی سے پہلے ہم نے اس تعریف کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔ اور اپنی جگہ مطمئن تھے کہ ہم ایک سلیقہ مند بیوی ثابت ہوں گے۔ لیکن جب واقعی بیوی کی گدی سنبھالی اور گھریلو معاملات کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو پتہ چلا کہ ہم قطعی اس کے اہل نہیں تھے۔ کیونکہ قدم قدم پر دوسروں کو ہم سے شکایت کا موقع ملتا رہا۔ یوں معلوم ہوا کہ جس طرح بیوی بن کر ہم نے اپنی سلیقہ مندی کا سکہ جمانے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا اس طرح ہمارے میاں نے بھی گھر بسانے سے پہلے ہی شکایتوں کی ایک فہرست تیار کرلی تھی۔ اب ایسی صورت میں ہم سوائے بوکھلا جانے کے اور کر ہی کیا سکتے تھے اور پھر تو خدا جانے بوکھلاہٹ میں کیا کچھ کر گزرے۔ اور سلیقہ مندی کی تعریف خدا جانے ہمارے ذہن سے کب اور کہاں پھسل پڑی۔

شادی کے تعلق سے بعض حکماء نے بڑی دلچسپ باتیں بیان کی ہیں۔ ویسے تو ہماری معلومات اس معاملے میں بہت محدود ہیں۔ صرف سنی سنائی سی بات ہے۔ کہ غالباً شیخ سعدی یا شاید حکیم سقراط سے کسی نے دریافت کیا کہ "جناب شادی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ شادی کرنا مناسب ہے یا نہیں۔؟" جواب ملا کہ "بھائی شادی ایک ایسا پھل ہے کہ جو کھائے سو پچھتائے، نہ کھائے سو پچھتائے۔" ان بزرگوں کے قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو ۹۹ فی صد

لوگ ایسے ملیں گے جو کھا کر پچھتانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

شادی کے بعد چند دن تو خواب سے گزر جاتے ہیں۔ یہ ہوش کس کو رہتا ہے۔ کہ میاں بیوی ہیں۔ اس وقت تو ہر بیوی اپنے کو محبوبہ ہی سمجھتی ہے اور شوہر صاحب سراپا عشق بنے رہتے ہیں۔ بیوی کے منہ سے نکلا ہر لفظ پھول جھڑتا نظر آتا ہے۔ ہر حرکت میں برکت نظر آتی ہے۔ اس کی لغزشیں بھی ادائے دلبری سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ لیکن اس وقت ہوش ٹھکانے لگتے ہیں۔ جب بیوی کی اداؤں میں بھی بھونڈا پن نظر آتا ہے۔ اور بیوی حیران ہو کر سوچتی ہے کہ یہ دم بھر میں کیا ماجرا ہو گیا — مگر شاباش ہے بیوی کے کلیجے کو کہ صبح سے شام تک اعتراضات کی بوچھار کو برسات کی پہلی پھوار سمجھ کر لطف اٹھاتی ہے۔ بلکہ گھر کے دوسرے فرائض کی طرح ان اعتراضات کو بھی ایک گھریلو فرض سمجھتی ہے۔

ایک بات واضح کرتی چلوں کہ یہاں ان بیویوں کا ذکر نہیں جن کے صبح و شام جلسوں، ہوٹلوں یا سماجی سدھار کی میٹنگوں میں بسر ہوتے ہیں اور جن کے بچے بورڈنگ ہاؤس یا ملازمین کی گودوں میں پلتے ہیں۔ میری گفتگو کا موضوع میری جیسی متوسط گھرانے کی بیویاں ہیں جن کی زندگی شوہر کی خوشنودی پر منحصر ہے۔ آیئے آگے پڑھیں۔

یاد نہیں پڑتا کہ شادی کے کتنے دن بعد ہم نے شکایت کا موقع فراہم کیا۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ پہلے اعتراض ہی نے ہم کو گہری نیند سے چونکا دیا۔ اور کچھ دیر یہ سوچنے کی کوشش کرتے رہے۔ کہ یہ اعتراض باموقع تھا یا بے موقع۔ اور ابھی کسی نتیجے پر نہ پہنچے تھے کہ شکایتوں کا وہ انبار لگا کہ ہم نے کسی نتیجے پر پہنچنے کا ارادہ قطعی ترک کر دیا۔ اور ہر بیوی کی طرح ہم بھی چند دن میں اعتراض پروف بن گئے۔ سالن میں مصالحوں کا غلط استعمال، کپڑوں میں بٹن ٹوٹے ہوئے پائے جانا۔ اور بچوں کی بدتمیزیاں۔ یہ تو ایسی شکایتیں ہیں جن کو ایک حد تک بیوی کے پھوہڑپن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنی کوتاہیوں کے بارے میں صفائی پیش کرنے کی اجازت بیوی کو مل جاتی تو شاید اعتراض سے کچھ مزہ کم ہوتے۔ مثلاً پکوان ہی کو لیجئے۔ ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہمارا شجرہ

کسی طرف سے بھی کسی شاہی رکابدار سے نہیں ملتا اور نہ ہی شادی کی یہ اولین شرط قرار پائی تھی کہ لڑکی ماہر پکوان ہو پھر شادی کے بعد ہم سے بہترین پکوان کی توقع رکھنا آخر کہاں کا انصاف ہے۔ ہم نے اپنے مقدور بھر کوشش بھی کہ کتابوں کی مدد سے کوئی بہترین چیز پکا کر میاں کی خوشنودی حاصل کریں۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

اب یہی دیکھئے اتوار کا دن سمجھ کر سوچا "لاؤ کچھ اچھی چیز پکائی جائے" روز تو بے چارے بھاگم بھاگ میں کھاتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک ہی دن تو کھانے سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ مگر توبہ کیجئے اعتراض نہ کریں تو مالک و مختار کا اظہار کیونکر ہو — نوالہ منہ میں رکھتے ہی ارشاد ہوگا — ٹھیک تو ہے۔ لیکن کچھ کسر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دادی جان مرحومہ کیا لذیذ مہاجنی بیگن پکاتی تھیں کہ اس کا ذائقہ آج تک زبان پر ہے۔ اس وقت غریب بیوی یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ کہ آیا وہ دادی جان بن کر مزے سے رہتی یا موجودہ حیثیت ہی میں خوش رہنا چاہیئے دل میں یہ ضرور خیال آتا ہے۔ کہ دادی جان کے ہاتھ کا سالن پوتی پوتا نے ضرور چٹخارے لے کر کھایا ہوگا۔ لیکن دادا جان مرحوم نے دادی جان کے پکوان کے متعلق کیا رائے قائم کی تھی دادی جان کا دل ہی جانتا ہوگا۔ آپ خواہ کتنی ہی توجہ سے ان کے کپڑوں کی درستی کرتی ہوں گی۔ لیکن اگر مہینوں میں ایک دفعہ بھی قمیض کا بٹن ٹوٹا ہوا رہ جائے تو سمجھ لیجئے آج تک کی دیکھ بھال پر پانی پھر گیا۔ فوراً پوچھ کچھ شروع ہو جائے گی۔ آخر تمہیں گھر میں کام ہی کیا ہے۔ بیکار بیٹھی رہتی ہو۔ اگر کپڑوں کی درستی کر دیا کرو تو کیا حرج ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ ہم گھر میں بیکار ہی تو بیٹھے رہتے ہیں۔ اب اگر حرف شکایت ہم بھی زبان پر لے آئیں اور گھر میں اپنی بیکاری کی فہرست پیش کریں تو نہایت معصومیت کے ساتھ کہا جائے گا۔ بخدا میرا مقصد اعتراض کرنا نہیں تھا میں تو محض توجہ دلانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اس کا اتنا اثر لو گی۔ اب آپ ہی بتایئے "اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا" گویا اب تک جو کچھ ہوتا رہا وہ اعتراض نہیں تعریف تھی اور آئندہ بھی جو کچھ ہوگا اس کو ہم اپنے حق میں دعائے خیر سمجھتے رہیں گے۔

خیر یہ تو تھیں گھریلو ذمہ داریاں جس میں بقول میاں کے بالکل اناڑی نکلے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسے مواقع آتے ہیں جب ہم کو پھوہڑ کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صبح بستر سے اٹھتے ہی اخبار ہاتھ میں آجانا چاہیئے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہماری غفلت کا نتیجہ ہے۔ جناب کے اخبار پڑھنے کی ادا بھی بڑی پیاری ہے۔ یعنی گھر میں جہاں جہاں بھی جائیں گے۔ اور جائیں گے ضرور، اخبار ساتھ ساتھ چلے گا اس انداز سے کہ ہر جگہ ورق چھوڑتے جائیں گے۔ گویا "چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستان میری" بیوی کا کام ہے کہ ان اوراق پر نظر رکھے کہ کون سا صفحہ کہاں رہ گیا ہے تاکہ میاں کے پڑھنے میں تسلسل باقی رہے۔ اگر ذرا بھی صفحات میں بے ترتیبی پیدا ہوئی تو بھلا ہمارے ان پڑھ ہونے میں کس کو کلام ہے ۔۔۔ اخبار میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ ناشتہ کے بعد دفتر کی تیاری کے لئے وقت تنگ ہو جاتا ہے۔ اور بھئی جلدی کا کام شیطان کا۔ کئی کئی بار تو الماری کھلتی ہے۔ کپڑوں کا ڈھیر پلنگ پر، اتارے ہوئے کپڑے زمین پر بکھر جاتے ہیں۔ بمشکل تمام دفتر سدھارتے ہیں۔ دس منٹ میں فون آتا ہے۔ فلاں فلاں کاغذ اور قلم بھول آیا ہوں بھیجو ۔۔۔ اتا پتہ ندارد ۔۔۔ یہ کام ہمارا ہے کہ کپڑوں کے انبار میں، غسل خانے میں، کھانے کی میز پر غرض جہاں جہاں سرکار نے قدم رنجہ فرمائے تھے ان چیزوں کو تلاش کر کے بھیجو۔ اگر اس تلاش میں ناکامی ہو تو یہ ہماری نہایت غیر ذمہ دارانہ حرکت تصور کی جائے گی۔ نہ صرف یہ بلکہ ناگہانی آفتوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی ہم میں مفقود ہے۔

ہم کو علم نجوم اور علم غیب میں بھی طاق ہونا چاہیئے، تاکہ میاں کے ارادوں اور پروگراموں سے واقف رہیں۔ جو وہ کبھی زبان پر نہ لائے ہوں۔ اتنا کہہ دینا کافی ہونا چاہیئے کہ آج تین بجے مدراس جا رہے ہیں۔ آگے آپ کو خود اندازہ کر کے سامانِ سفر تیار کرنا ہوگا کہ سفر کس نوعیت کا ہے۔ دفتری کام ہے، شادی میں شرکت ہے یا خدا نہ کرے کوئی غمی کا موقعہ ہے۔

بیوی کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لئے میاں کی آمدنی سے بہتر کوئی کسوٹی نہیں۔ کیونکہ

گھر کے تمام کاروبار کا انحصار اسی پر ہے۔ یہ ایک وہم اور عام شکایت ہے۔ کہ بیوی فضول خرچ ہوتی ہے۔ اس کے حساب کتاب میں بچت کا کوئی خانہ نہیں ہوتا۔ ہر گھر کی طرح ہمارے گھر میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہتا ہے۔ کہ آخر بچت کیوں نہیں ہوتی۔ ہمارے میاں سلجھی ہوئی طبیعت کے انسان ہیں اور اپنے متعلق یہ خوش فہمی بھی رکھتے ہیں کہ بہت کفایت شعار ہیں۔ لہٰذا انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایک مہینہ وہ گھر چلا کر دکھائیں گے کہ دیکھو بچت یوں ہوتی ہے اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ ہم نے اس کے اس نیک خیال کی دل سے داد دی اور اس مبارک مہینے کے آنے سے پہلے ہی فرصت کے اوقات کو اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا ایک خوبصورت پروگرام مرتب کر ڈالا۔ پہلی تاریخ کو حسب عادت محترم نے تنخواہ ہمارے حوالے کرنا چاہی ہم نے نہایت ادب سے یہ کہتے ہوئے لینے سے معذرت چاہی کہ آج سے ہماری رخصت خاص شروع ہو رہی ہے اب اپنے ہی گھر میں ہماری حیثیت ایک تماشائی جیسی تھی اور اس وقت جو لطف تماشائی بن کر اٹھایا تمام عمر اس کی لذت نہیں بھلائی جا سکتی۔ چند دن تک گھر میں دن عید اور رات شب برات رہی۔ بچوں کی ہر جا و بے جا فرمائش پوری کی گئی۔ ہر روز مرغ مچھلی کھانے کو ملی۔ بچوں کو ناشتے پر دو دو انڈے کھلائے گئے۔ ڈھیروں میوہ گھر میں نظر آنے لگا۔ وقتاً فوقتاً ہمکو بھی سنایا جاتا کہ ہم نے ان کے بچوں کو ترسا ترسا کر کھانے کو دیا۔

پھر بھی ہنگامی کاروبار رہا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ رفتہ رفتہ مرغ مچھلی غائب ہو گئی۔ بچے پھر ایک انڈے پر آ گئے۔ میوے کا نام و نشان باقی نہ رہا اور آخر وہ دن آ پہنچا جس کا ہمکو بے چینی سے انتظار تھا یعنی میاں نے اچانک ایک دن مژدہ جانفزا سنایا کہ تنخواہ ختم ہو گئی۔ ہمارے منہ سے انا للہ نکلتے نکلتے رہ گیا۔ اور سنبھل کر یاد دلایا کہ ابھی تو مہینہ ختم ہونے میں ایک ہفتہ باقی ہے۔ پوچھا پھر کیا کیا جائے۔ یا کچھ ایسی معصومیت سے مشورہ مانگا گیا تھا کہ ہمکو سچ مچ رحم آ گیا ہم نے الماری کھول کر کچھ رقم پیش کی کہ فی الحال اس سے کام چلائیے حیرت سے ہمارا منہ دیکھتے ہوئے پوچھا یہ کہاں سے آئی۔ ہم نے عرض کی بس بچت ہی سمجھئے۔

اس کے بعد یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ دن اور آج کا دن بجٹ کا موضوع درمیان گفتگو نہ آیا۔ برس ہا برس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میاں بیوی کے رشتہ کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لئے شکایت کرتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ نوک جھونک ہوتی رہنا چاہیئے۔ اجی جناب ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ جس گھر میں گلے شکوے نہ ہوں وہ بھی کوئی گھر ہے "میرا تو جی گھبرا جائے۔ بھلا بتایئے آپس میں نہ جھگڑیں تو کیا رستہ چلتوں سے الجھیں "توبہ ایسا ہو! ذرا ان شکووں کے پیچھے جھانک کر تو دیکھئے کتنا خلوص کتنا پیار اور کیسی یگانگت ہوتی ہے ان چھوٹے چھوٹے شکووں میں اور پھر "بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر" ●

قاضی صاحب اور ادب لطیف

ایک دن میں نے دیکھا کہ سورج کی روشنی نہایت ٹھنڈی اور موسم گرما کی ہوائیں بے حد خشک ہیں۔ تمام کائنات پر ایک سکون مطلق طاری ہے اور ۔۔۔۔ میں ایک میز کے سامنے تنہا بیٹھا ہوں۔ کاغذوں اور کتابوں کا انبار میرے سامنے ہے اور میرا تمام وجود روحانی اساتذہ سلف کے ان دماغوں پر لوٹ رہا ہے۔ جو میرے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ عظمت گزشتہ کی یادگاریں سطوت دیرینہ کے افسانے شاہراہ حیات کے بہت سارے نشان راہ شہرت کے مینار دولت کے شکستہ در و دیوار عزت کے نقش ہائے بے رنگ کتنے افسانے غرض کہ اس چھوٹی سی میز پر ایک جہان آباد اور میں ۔۔۔۔ نہ اتنا بلند ہوں کہ خدا کی مخلوق مجھے معلوم کہ ہم رتبہ نظر آئے نہ اتنا پست ہوں کہ خلقت کے گرداب معصیت میں پھنس جاؤں اس تنکے کی طرح جو دنیا کے بہاؤ سے جدا ہو جاتا ہے گزرنے والوں کے پیام مجھ تک آتے ہیں اور میرے پیام ان تک جاتے ہیں پر میرا سکوت مطلق اسی دنیا میں مجھکو بہاؤ سے الگ لئے کھڑا ہے ایک فقیر کہ جس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں اور ایک رئیس کہ اس پر سمندر کے موتی اور خشکی کے ہیرے نچھاور ہو رہے ہیں عبرت آموزی میں میرے لئے یکساں ہیں۔

نام نہیں دیا جا سکتا۔

قرینہ، یا بھونڈا پن اس معاملے میں بچے سب سے زیادہ چغلخور ہوتے ہیں۔ وہ زبان سے چغلی نہیں کھاتے بلکہ ان کے طور طریقے ان کے ماحول کی غمازی کرتے ہیں کہ سلیقہ ہے یا بے ترتیبی

غرض احساس جمال زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے سماجی زندگی ہو یا گھریلو ماحول ہم آہنگی اور مناسبت بہت اہم رول ادا کرتے ہیں ہم آہنگی اور تناسب سے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں جس طرح ساز و آواز کی ہم آہنگی دل کی گہرائیوں کو چھو لیتی ہے اور راگ وقت اور موسم کی مناسبت سے الاپا جائے تو وجد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی طرح اگر یہی اصول زندگی کے چلن میں برتا جائے تو احساس جمال کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گھر کی بناوٹ ہو یا سجاوٹ، یا لباس کی تراش ہو رنگوں کا انتخاب ہو یا چیزوں کو برتنے اور رکھنے کی بات ہو وقت اور موسم کی ہم آہنگی اور مناسبت پیش نظر رہتی ہے ہر موسم اپنا ایک مزاج رکھتا ہے اور انسان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اپنے اپنے ذوق اور احساس جمال کے مطابق بدلتے موسم کے اتار چڑھاؤ سے لطف اندوز ہوتا ہے اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے کچھ دیر کو فرار کا ذریعہ ڈھونڈ لیتا ہے۔

ہر شخص اپنا ایک نظریۂ حیات رکھتا ہے کسی کے نزدیک "نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا" اور کسی کے نزدیک "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" میرے نزدیک زندگی نام ہے قرینے کا توازن کا! بھرپور زندگی گذارنے اور پورے حواس کو جگانے کے لئے احساس جمال چاہیئے۔

اللہ پاک نے زندگی عطا کی سلیقے سے جینے کے لئے عقل کی رہنمائی بھی ملی اور اختیار بھی! پھر گلہ کیسا بقول اقبال "تو شب آفریدی، چراغ آفریدم" یعنی تو نے رات بنائی اور میں نے اسکو چراغ سے روشن کر دیا احساس جمال زندگی کا چراغ ہی تو ہے!!

احساس جمال اپنے میں اتنی وسعت رکھتا ہے کہ چند صفحوں میں اس کا سمانا ناممکن ہے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اب ادبیات کی اعلیٰ تعلیم میں جمالیات کو بھی داخل نصاب کیا گیا ہے خوش نصیب ہونگے وہ طالب علم جو زندگی کے صحیح راستے تلاش کرنے میں اس شعبہ سے بھرپور استفادہ کریں گے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رنگ بھر کر ایک حسین دنیا آباد کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔

تا خنوں پر مہندی کی سرخی ساری کا لمبا آنچل پیٹھ سے لپٹ کر دوسرے شانے پر پڑا ہوا ہونٹوں پر پان کی لالی چلیئے اللہ اللہ خیر صلا۔!!

بہر حال جب تک بچے چھوٹے رہے ہم بغیر کسی مداخلت کے اپنے فیشن پر قائم رہے۔ اور دوسروں کے جدید فیشن پر آزادی کے ساتھ انگلیاں اٹھاتے رہے۔ لیکن جوں جوں بچے بڑے ہونے لگے میں محسوس کرنے لگی کہ میرے ہی بچوں کی انگلیاں مجھ پر اٹھ رہی ہیں۔ شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو کہ میرے کسی نہ کسی پہناوے پر اعتراض نہ ہوتا ہو چوٹی سرمے سے لے کر ساڑی کے آنچل تک پر تنقید ہونے لگی پہلے اشاروں اشاروں میں پھر رفتہ رفتہ کھلم کھلا اعتراضات شروع ہو گئے۔ "ممی آپ بہت اولڈ فیشن ہیں میری دوستوں کی ماؤں کو دیکھئے آپ ہی کی عمر کی ہونگی مگر کتنی young لگتی ہیں" کبھی بال بنانے پر تنقید ہوتی "آپ ذرا سا ہیر اسٹائل CHANGE کردیں تو بہت young معلوم ہونگی" یہ ساری باتیں سنتی اور انجان بن جاتی کبھی بچوں کو سمجھانے کی کوشش کرتی "بھئی ہر فیشن ہر شخص پر اچھا نہیں لگتا جو اسٹائل تم کو پسند ہے وہ ہماری عمر کے لیے موزوں نہیں ہے" کبھی بری طرح ڈانٹ دیتی "اری لڑکی کیا دیوانی ہوئی ہے۔ کیا خود کو جاپانی گڑیا بنالوں" لیکن رفتہ رفتہ اپنی جھڑکیاں بھی بے سود نظر آنے لگیں تو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہو گئے۔ خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچے احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں اور خدانہ کرے اولڈ فیشن ہونے کی پاداش میں ماں کو ماں کہنے سے شرمانے لگیں!! بہت ہی غور و خوص کے بعد ہم نے اپنی شادی کی سالگرہ کے موقع پر فیشن کرنے کا اعلان کر دیا۔ اعلان تو کر چکے تھے لیکن خوب معلوم تھا کہ اس میدان میں ہم بالکل کورے ہیں فیشن قسم کی کسی چیز کا کوئی تجربہ نہ تھا اس کی تیاری کے لیئے کچھ وقت درکار تھا چنانچہ فیشن کرنے کے ارادے کے ساتھ ہی تیاری شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھنا تھا کہ آخر ہم میں کمی کہاں ہے؟!! چنانچہ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اپنے سراپا کا جائزہ لینا شروع کیا سر سے پیر تک کئی کئی بار اپنے کو ٹھوکا بجایا تو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ سر سے ڈیڑھ گول ہے۔ یعنی لمبی چوٹی کی جگہ پودینے کی گڈی نے لے لی ہے اور جو چند بال رہ گئے ہیں ان میں چاندی جھلک رہی ہے۔ چہرے کی شادابی میں پیلاہٹ کچھ زیادہ ہی نظر آئی غرض اپنا حلیہ دیکھ کر ہمت جواب دیتی معلوم ہوئی وہیں کھڑے کھڑے عمر کا حساب لگایا تو فیشن کے تصور ہی سے شرم آنے لگی۔ لیکن

اعلان تو ہو ہی چکا تھا باوجود اپنی طرف سے فیشن کے تمام نقصانات گنواہے اور یہاں تک کہا کے کہ بھئی بوڑھی گھوڑی کو بھی لال لگام نہیں سجتی ہم تو پھر انسان ہیں!! ہماری ایک نہ چلی ہماری ہر مشکل کا حل تلاش کر لیا گیا۔ بالوں کے لیئے خضاب جوڑے کے لئے مصنوعی بال فراہم کیئے گئے رہا چہرے کو جوان بنانے کا مسئلہ سو بیٹی صاحبہ نے اپنے ذمے لے لیا۔

تو جناب فیشن بالوں سے شروع ہوا خضاب کا کوئی تجربہ نہیں تھا ترکیب استعمال کی مدد سے خضاب کا پچارا سر پہ پھرنے لگا میاں دفتر بچے اسکول جا چکے تھے فرصت ہی فرصت تھی پوری توجہ کے ساتھ بال کالے کیئے گئے فیشن پہ پہلی مہم سر کرنے کی ٹھانی پانچ منٹ بھی نہ گذرے ہونگے کہ چھوکرا سر پہ سوار ہو گیا سودا لانے کے لیئے پیسے مانگ رہا تھا اس کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ماما جی کہیں انھیں پکوان شروع کرنے کے لیئے سامان چاہیئے تھا خیال تھا جلد ہی نمٹ جاوں گی دونوں سے پانچ منٹ کی مہلت مانگی اور اپنے بناؤ میں مصروف ہو گئی کہ اچانک ماما جی کی آواز نے چونکا دیا وہ کہہ رہی تھیں ۱۲ بج گئے سودا کب آئیگا پکوان کب شروع کرونگی!! پیروں تلے سے تو زمین ہی نکل گئی سچ مچ آخر کھانا کب تیار ہوگا اور بچوں اور دفتر پہونچیگا۔ اگر آپ کو خضاب کا تجربہ ہے تو یقینی میری پریشانی کا اندازہ ہو گیا ہوگا بس بچا کچا خضاب جو یوں بھی غالباً ہمارے بالوں کی سفیدی کے حساب سے کچھ زیادہ ہی بن گیا تھا الٹا سیدھا تھوپا اور باورچی خانے میں گھس گئی اور سوچتی رہی کہ یا اللہ فیشن کرنے کو خواتین کو وقت کیسے مل جاتا ہے یہاں تو سر منڈھاتے ہی اولے پڑ گئے!! بہر حال جلدی میں پکوان بھی الٹا سیدھا ہی ہوا پھر بھی بچوں اور میاں کو دیر سے روانہ کیا گیا ضمیر الگ شرمندہ کرتا رہا کہ جس کام کا سلیقہ نہیں اسکا شوق ہی کیوں۔ غرض کافی دیر تک بالوں کی طرف دھیان نہ گیا جب کاموں سے فارغ ہوئی اور کو وقت کم ہوئی تو سر مبارک کی طرف پھر توجہ مبذول فرمائی اب جو آئینے میں دیکھتی ہوں تو بال ہی کیا مانگ تک کالی ہو چکی ہے چہرے پہ جا بجا کالے ٹیکے لگے ہیں ہاتھوں پہ نظر پڑی تو تمام ناخن خضاب میں رنگ چکے تھے پہلا تجربہ دھبوں کو نکالنے کی ترکیب معلوم نہ تھی سوائے صبر کے کیا کر سکتے تھے البتہ آئندہ خضاب نہ کرنے کا عہد ضرور کر لیا۔

اب سنئیے کہ اصل دن یعنی شادی کی سالگرہ کا دن آپہونچا جبکہ ہمکو پوری طرح فیشن ایبل بننا تھا خیال یہ تھا کہ ۱/۲ ۵ بجے تک تیار ہو جانا چاہیئے تاکہ ہر سال کی طرح گروپ فوٹو اور

سنگھار کا پروگرام تمام رہے۔ اس لحاظ سے میک اپ کے لئے تین گھنٹے بہت کافی سمجھے گئے دوپہر کے کھانے کے بعد ہم بیٹی کے کمرے میں داخل ہو گئے چہرے پر سے خضاب کے دھبے مٹ گئے تھے البتہ ناخنوں پر کچھ اثر باقی تھا چنانچہ یہیں سے سنگھار کی ابتدا ہوئی پہلے ناخنوں پر سرخی لگائی گئی جس کی بالکل عادت نہ تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انگلیاں سُن ہو گئی ہیں اس کے بعد جوڑا باندھنے کی باری آئی اب مانگ نکالیں تو کیونکر وہ خضاب کی نظر ہو چکی تھی لہذا BACK COMB کرنا طے پایا ظاہر ہے یہ اوندھی سیدھی کنگھی کرنا اپنے بس کی بات نہ تھی سر بیٹی کے حوالے کر دیا گیا اور خود آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے ایک گھنٹہ کی محنت کے بعد جوڑا تیار ہوا۔ یہاں تنگ چوٹی کی عادت اور جوڑے کا یہ حال کہ اب کھلا اور جب کھلا آئینے پر نظر گئی تو اپنا عجیب حلیہ نظر آیا سر پر چڑیا کا گھونسلا گردن پر مصنوعی بالوں جوڑا کا ہے کو ہوا بس ایک جھونج سمجھ لیجئے کہ جوڑ لٹکا ہوا ہے بار بار جی چاہتا کھول ڈالو لیکن صاحبزادی کا اصرار "ابا ممی یہ جوڑا آپکو کتنا suit کر رہا ہے اب وہ ہم کو سوٹ کر رہا تھا یا نہیں لیکن اتنا ضرور تھا کہ زندگی کا آدھا لطف ختم ہو چکا تھا اس کے بعد چہرے کی باری آئی ہم نے اس کو بھی بیٹی ہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں نہ جانے کتنی دیر میں چھٹکارا ملا لیکن اس عرصہ میں ایک پہلو بیٹھے بیٹھے کمر جواب دے چکی تھی بیٹی نے بڑے فخر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے آئینہ دکھایا۔

"اف ممی ہنگامہ! کتنی young دیکھ رہی ہیں آپ ——!" young کا لفظ سن کر دل ہی دل میں ہم بھی خوش ہو گئے اور بڑے اشتیاق سے آئینے کی طرف نگاہ اٹھائی پہلی نظر میں چہرے پر کسی چیز کی کمی نظر آئی غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہونٹ غائب ہیں اور جب وہ نظر آئے تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی سفیدی مائل لپ اسٹک لگے ہونٹ بالکل برص کی بیماری معلوم ہو رہے تھے جو قطعی ناقابلِ برداشت تھے چنانچہ رنگ بدلنا ہی پڑا عجیب چیز چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں تھی وہ تھی آنکھیں جن کا خاصا حشر بنا تھا یعنی سرمہ یا کاجل کی ڈوری جو آنکھوں کے اندر پھیری جاتی تھی اور جس کی تعریف میں شاعروں نے قلم توڑ دئے تھے ہماری آنکھوں سے نکل کر پلکوں پر آ گئی تھی ڈوری کا ہے کو ہوئی اچھی خاصی کاجل کی رسی تھی جو پلکوں پر چپکا دی گئی تھی یعنی آنکھوں سے زیادہ پلکیں نمایاں تھیں۔ کسے معلوم تھا کہ اولاد کے ہاتھوں یہ گت بن جائیگی ہم نے طے کر لیا کہ اب کھائی تو کھائی پھر کھائی تو رام دہائی!!

اب سب سے اہم مرحلہ ساری کا تھا میں اپنے اسٹائل پر اصرار کر رہی تھی اور بیٹی کا اصرار تھا کہ ایک بار کر کے دیکھ لیں (اُنکی مرضی) کی ساری باندھنے میں نے بھی سوچا جب اُلٹی پن سروع کیا تو موسل سے کیا ڈرنا جہاں اتنی گت بن چکی ہے چلو یہ بھی سہی غرض خدا نے کہاں کہاں (PINS) لگا کر ساری باندھی گئی کہ ہم ہلتے جلنے کے قابل نہ رہے۔ کل تک جو ہم محفلوں میں خواتین کو اس اسٹائل کی ساری باندھے دیکھکر رحم کی نظر سے دیکھا کرتے تھے کہ "اُف بے چاریاں کیسی اپنے ہاتھوں جکڑی پڑی ہیں ہمارے فیشن کے نہ آزادی کا اُٹھنا بیٹھنا رہا نہ اطمینان) کا چلنا پھرنا اگر لگے ایسے فیشن کو شکنجہ میں پھنس کر رہ گئیں فیشن زدہ خواتین پہ کبھی کبھی تو کانچ کے برتنوں کا شبہ ہوتا ہے۔ کہ ذرا جنبش کی اور ٹوٹیں ۔۔! تو صاحب بڑے بول کا سر نیچا آج ہم بھی انھیں فیشن زدہ خواتین کی صف میں ہاتھ باندھے بے حس و حرکت شامل تھے۔

میاں دفتر سے آچکے تھے اور ہمارے انتظار میں سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہے تھے آخر تنگ آکر تقاضے شروع ہو گئے گھڑی دیکھ کر اطلاع کی گئی کہ پکچر کا پروگرام ہو گیا یعنی وقت نکل چکا۔ بہ مشکل تمام تیار ہو کر باہر نکلنا چاہا تو قدم جیسے رکنے لگے اس حلیہ میں سامنے جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی یا اللہ کہا کر دوں بڑی مشکل سے کمرے سے باہر آئی بہ وہیں کھڑے تھے مجھ پر جو نظر پڑی تو گھڑوں پانی پڑ گیا میری جھینپ مٹاتے کو بات بناتے ہوئے بولے اچھا "ایک پان تو کھلا دو پھر چلیں" ہم تو تھے ہی بوکھلائے ہوئے یہ خیال نہ رہا کہ فیشن نے ہماری نقل و حرکت کی پوری آزادی سلب کر کے شکنجے میں کس دیا ہے پاندان اٹھانے جو جھکی تو پنوں (PINS) میں اٹکی ساری چھم سے نکل گئی یہ ہماری پسندیدہ ساری تھی پھٹنا غضب ہو گیا سارا موڈ غارت ہو گیا لیکن میاں کی خاطر منظور تھی اس لئے پروگرام ٹالا بھی نہ جا سکتا تھا اور پھٹی ساری پہن کر باہر جانا بھی ناممکن تھا جب ساری بدلنا ہی ٹھہرا تو سوچا کیوں نہ اپنے اصلی رنگ میں آجاؤں اس طرح جناب ساری کا پھٹنا بہانا بن گیا یوں سمجھیئے کہ بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور شکنجوں سے آزاد ہو کر اطمینان کا گہرا سانس لیا لیکن ساری اور وقت کی بربادی کا خیال کر کے کہنا پڑتا ہے کہ بہت پچھتائے فیشن کر کے !!!

نئے سال کے عہد

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہمارے بچپن میں دو سال کا ایک سال ہوا کرتا تھا یا کم از کم محسوس تو ایسا ہی ہوتا تھا لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی سال اسی رفتار سے گھٹتا چلا گیا اور نوبت تو یہاں تک پہنچی کہ ہر سال آندھی کی طرح آتا اور طوفان کی طرح گزرتا چلا جاتا ہے اور اس سے پہلے کہ گذشتہ کیئے ہوئے عہدوں کا جائزہ لیں نیا سال سر پر آجاتا ہے بھلا اس بھاگم بھاگ میں کوئی کیا عہد کرے اور پھر آدمی خواہ مخواہ تو عہد کرتا نہیں کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہی ہوگی! اور جب عہد کر لی ہے تو نئے سال کے عہد سے پہلے رخصت ہوتے ہوئے سال کے عہدوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ آخر اتنے عہد و پیمان جو اس عزم سے باندھے تھے اس میں کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی لیکن خدا جانے یہ ڈسمبر کی آخری گھڑیاں عقل کی آنکھوں پر کیسی پٹی باندھ دیتی ہیں کہ ہم قطعی یہ بھول جاتے ہیں کہ آج تک جو عہد کیئے تھے اس میں ہمیشہ شکست فاش کھائی ہے یعنی ان میں سے بعض تو عملی شکل اختیار نہ کر سکے اور جن پر عمل کیا گیا ان کی زندگی بھی بس چند روزہ ہی ثابت ہوئی مثلاً ۱۹۶۲ء کے آخری دن ہمارے صاحب نے بہ آواز بلند یہ عہد کیا کہ نئے سال سے وہ سگریٹ پینا چھوڑ دیں گے اور چونکہ آخری دن تھا اور ہمیشہ کے لیئے سگریٹ سے جدا ہونے میں صرف چند گھنٹے باقی تھے چنانچہ ان چند گھنٹوں میں اتنے سگریٹ پیئے کہ اگر حساب لگایا جاتا تو شاید آنے والے سال کا پورا کوٹہ تیار ہو جاتا چونکہ اب ہمیشہ کو چھوڑنا ہی تھا لہذا جی بھر کے پینے میں کوئی نقصان بھی نہ سمجھا گیا

سگریٹ کا ایک آخری طویل کش لے کر سو گئے اور جب نئے سال کی پہلی صبح نمودار ہوئی تو چہرے پر نئی صبح کی تازگی کے بجائے رونے کی سی کیفیت طاری تھی آخر نئے سال کا عہد تھا کوئی مذاق تھوڑی تھا نہایت ثابت قدمی کے ساتھ دن گذرا صرف دن بلکہ آپ کو حیرت ہوگی کہ پورا ایک مہینہ بغیر سگریٹ کے گذر گیا۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ کس طرح گذرا جتنی دیر گھر پر رہتے اس طرح ٹہلتے جیسے کوئی رمضان میں مغرب کی اذاں سننے کے لئے ٹہلتا ہے کئی بار کہا کہ بھئی سگریٹ کے لئے کوئی اذاں یا سائرن نہیں ہوتا آرام سے بیٹھو اور دھیان کسی دوسری طرف لگاؤ ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر انسان ہمدردی کر بھی کیا کر سکتا ہے اپنے ہاتھوں اپنے پر پابندیاں عائد کرنے کا کیا علاج! غرض بمشکل تمام ایک مہینہ گزرا فراق کی پہلی جیسی کیفیت بھی نہ رہی تو جناب کو اطمینان ہو گیا کہ چلو ایک بری عادت سے چھٹکارا ملا لیکن دنیا کب چین لینے دیتی ہے ابھی اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ ایک روز ایک مہربان تشریف لائے خود سگریٹ پینے لگے تو ان کو بھی پیش کیا کچھ دیر ادھر سے انکار اور ادھر سے اصرار رہا آخر جی تو نہ چاہتا تھا لیکن اخلاقاً قبول کرنا ہی پڑا۔ اب کیا تھا ایک منہ لگنے کی دیر تھی کہ ہر وقت یہ خواہش کہ اے کاش کوئی سگریٹ نوش قسم کا دوست آئے اور ان کو اصرار کر کے پلائے اور شکر خورے کو اللہ شکر ہی دیتا ہے دوست آتے رہے اور اصرار کر کے پلاتے رہے لیکن اصرار پیرا آخر کب تک عمل کرتے ایک دن دفتر سے تشریف لائے تو سگریٹ کا ڈبہ بھی آ ہی گیا چلئے سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ جب میاں نے سگریٹ چھوڑنے کا عہد کیا تو بھلا بیوی کیوں پیچھے رہتیں جب کہ زمانہ بھی قدم ملا کر چلنے پر مجبور کر رہا ہے!! بس ہم نے سوچا کہ جب وہ سگریٹ چھوڑ سکتے ہیں تو ہم کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور چھوڑنا چاہیئے پان تمباکو کی عادت نہیں تھی البتہ اپنے مزاج کی اصلاح پر توجہ دینا ہی مناسب معلوم ہوا لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ

آخر اصلاح کس چیز کی ہو بظاہر ہر مزاج میں عادات و اطوار میں ایسی خرابی نہیں
جس کی اصلاح ضروری قرار دی جائے اپنی تمام عادتوں پر گہری نظر ڈالی ظاہر و باطن
سب ٹٹول ڈالا کوئی عیب ہوتا تو نظر آتا ایسا معلوم ہوا کہ ہم انسان کاہے کو ہیں فرشتہ ہیں!!
اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت ایک کہاوت یاد آئی کہ اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا
دوسرے کی آنکھ کا نظر آجاتا ہے۔ بات کچھ دل کو لگی۔ ہماری آنکھ کے کون کون سے تنکے لوگوں
کو نظر آئے ہم نے اس پر غور کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ہم بچوں کے ساتھ بہت سختی
برتتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ہماری غلطی نہ تھی بلکہ ہم تو بزرگوں کے اس قول پر عمل کر رہے
تھے کہ "کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو دشمن کی نظر سے" بہرحال ہم نے نئے سال
کا عہد کر ہی ڈالا کہ آئندہ سے بچوں پر سختی نہ کریں گے اور ان کو آزادی کے ساتھ
پلنے اور بڑھنے کے پورے ذرائع فراہم کریں گے اور خود کو خوش مزاجی کا مجسمہ
بنا کر پیش کریں گے چلئے صاحب عہد و پیماں ہوئے اور سو گئے صبح کو ایک ہنگامے
کے ساتھ بیدار ہوئے ابھی کچھ نیند ہی میں تھی کہ کانوں میں طرح طرح کی آوازیں
آنا شروع ہوئیں جب ذرا نیند کا غلبہ کم ہوا تو معلوم ہوا کہ بچے آپس میں
لڑ رہے ہیں بہت غصہ آیا کہ ایک تو نیند خراب ہوئی اور دوسرے صبح صبح
نہ اللہ کا نام نہ رسول کا، لڑائی جھگڑا شروع ہوگیا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لئے
جھٹکے کے ساتھ اٹھی ہی تھی کہ نئے سال کا عہد یاد آگیا بمشکل تمام غصہ پر
قابو پایا۔ البتہ یہ کوفت ہوئی کہ آخر پہلی جنوری کو اسکول کیوں بند ہوتے ہیں! بچوں
کو نہایت نرم و مشفقانہ لہجہ میں لڑائی کے عیب و میل جول کے فوائد سمجھائے اور دل ہی دل
میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بڑا نازک وقت آگیا تھا ساتھ خیریت کے ٹل گیا۔ لیکن بچے
ہمارے اس عہد سے واقف ہو چکے تھے اور ان کو ہماری کی ہوئی ساری زیادتیوں
کا بدلہ لینے کا بہترین موقع ہاتھ آیا تھا بھلا وہ کیوں چوکتے تو جناب سنہ ۶۴ کا پہلا دن

یوم حشر ثابت ہوا گھر کا نقشہ ہی تبدیل کر کے دیا جتنا ہنگامہ اور جتنی بے ترتیبی کر سکتے تھے وہ اس دن کر کے چھوڑی دن میں کئی بار غصہ آیا لیکن عہد نبھانے کی خاطر تلخی کو شربت کے گھونٹ بنا بنا کر پیتی رہی۔ شام ہونے تک بچوں کا ہنگامہ پورے عروج پر آچکا میرے اعصاب جواب دے چکے تھے اگر کچھ دیر اور برداشت کرتی تو پاگل ہو جاتی نتیجہ یہ ہوا کہ نئے سال کے عہد پر تو سو بار لعنت بھیجی پر بچوں کی خوب مرمت کر کے ایک کمرے میں ڈالا اور خود نڈھال ہو کر پڑ رہی اب غور کرتی ہوں تو یہ عہد بھی عجیب مضحکہ خیز حرکت معلوم ہوتی ہے اچھی خاصی اپنی مرضی اور آرام کی زندگی چھوڑ کر بیٹھے بٹھائے نئے سال کے ساتھ عہد کر کے پابندیاں عائد کرنا کونسی عقلمندی ہے دیکھئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی میں تو ایک مثال دے رہی تھی کہ کس طرح عہد کر کے اپنی شامت کو دعوت دیتے ہیں اور کمال تو یہ ہے کہ پھر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے بلکہ جیسے پھر نیا سال آتا ہے تو پھر ایسی ہی حماقتوں کے لئے پوری مستعدی کے ساتھ تیار ہو جاتے ہیں۔

سچ پوچھیئے تو عہد کرنے کو ساری زندگی پڑی ہے موقعہ اور حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے عہد کے بہت سے موقعے آتے رہیں نئے سال میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ اس کی آمد پر عہد کیے جائیں اور طرہ یہ کہ عہد پورے بھی کیے جائیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو بچپن کو چھوڑ کر تیس سال سے مسلسل نئے سال آتے اور جاتے دیکھ رہی ہوں۔ لیکن آج تک کسی نئے سال میں کوئی انوکھا پن نظر نہ آیا۔ سوائے اس کے جب آجاتا ہے دماغوں میں انتشار پیدا کر دیتا ہے عہد تو بہت کیے جاتے ہیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہتا ہے۔ میری ناچیز رائے تو یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے نئے سال کے فریب سے بچئے اور اگر خدا نخواستہ آپ اس کے جال میں پھنس کر عہد کرنے پر مجبور ہی ہو جائیں تو عہد ضرور کیجیے لیکن سمجھ کر کیجیے کہ جو گرجتے ہیں وہ

زندگی کا چلن

احساس جمال

زندگی کا بھی عجیب چلن ہے جب دیکھو ناہموار راستے اپنے لئے تلاش کرتی ہے ایسے راستوں پر چلنا زندگی کی بھی عادت سی بن گئی ہے۔ نت نئے مسائل کھڑے کر دینا اس کا مزاج بن چکا ہے ہر وقت مشکلات اور مسائل میں گھری رہنے کے باوجود، زندگی سے اتنا پیار کیوں ہے؟ کبھی سوچا ہے آپ نے؟ ممکن ہے اس سوال کے بہت سے جواب ہوں لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں کہوں گی زندگی کا حسن یعنی احساس جمال جو کائنات میں توازن، تناسب، اعتدال اور قرینہ پیدا کرتا ہے اس کی تفسیر اقبال نے یوں بیان کی ہے کہتے ہیں کہ

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(یعنی میں پتھر سے آئینہ بناتا ہوں اور زہر سے آب حیات بنا دیتا ہوں)

اسی سے انسان کے جذبہ تخلیق کو تسکین ملتی ہے اور زندگی پر پیار آنے لگتا ہے۔ کائنات کے ہر شعبہ میں جمالیاتی پہلو موجود ہے جو زندگی کو بکھرنے سے باز رکھتا ہے۔ احساس جمال ضد ہے بھونڈے پن کی اور یہی بھونڈا پن جب زندگی میں داخل ہو جاتا ہے تو زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اور کئی زندگیاں اسکی لپیٹ میں آجاتی ہیں۔

زندگی میں توازن برقرار رکھنے کے لئے احساس جمال دل و نظر کے لئے ایک نعمت و برکت ہے جس طرح بنا عورت گھر کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح احساس جمال سے محروم عورت کا وجود بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

یوں تو احساس جمال اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح کو عطا فرمایا ہے فرق یہ ہے کہ انسان کو عقل دے کر اسکا صحیح مصرف بھی واضح کر دیا ہے۔ اور عورت نے تو اس جوہر کو بڑی فیاضی اور رچاؤ کو ستی

سے بہت کرنہ تدگی کے چلن کو حسن بخشتا ہے۔

اکثر لوگ جب احساس جمال کی بات کرتے ہیں ان کی گفتگو سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ دولت کا سہارا لئے بناء ذوق جمال کی تسکین ہو ہی نہیں سکتی حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ دولت کو سلیقہ سے خرچ کرنے کے لیئے احساس جمال کی ضرورت پڑتی ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ دولت ذوق جمال کی محتاج ہے!! روپئے پیسے کے بل بوتے پر گھر کو قیمتی سامان سے تو بھرا جاسکتا ہے بلکہ یہ نوادرات نمود و نمائش کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں لیکن سلیقہ اور قرینہ نہ ہو تو تسکین نظر حاصل نہیں ہو سکتی۔

اتفاق سے میں نے ایسے گھر بھی دیکھے ہیں جہاں آمدنی کا حساب یہ ہے کہ روز کنواں کھودو اور پانی پیو الیکن ایسے گھروں میں جو قرینہ اور توازن نظر آتا ہے وہ بد ذوق دولت مندوں کو نصیب نہیں۔

بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی یاد آگئی اگر اسکو یہاں دوہرا دوں تو بے موقع نہ ہوگی کہانی کچھ یوں تھی۔۔کہ ایک صاحب تھکے ہارے گھر پہونچتے تو الجھے الجھے سے رہتے اور بیوی سے کہتے "بیوی ذرا بن کر بیٹھو" بیوی غریب ہر روز میاں کے آنے سے پہلے سولہ سنگھار کئے میاں کی منتظر رہتی لیکن میاں کا تقاضہ کہ "بیوی بن کے بیٹھو" جوں کا توں ہی رہا۔ آخر میاں کے تقاضوں سے پریشان ہو کر بیوی نے پڑوسن کو صورتحال بتا کر اپنی الجھن کا حل مانگا۔ پڑوسن سمجھدار اور جہاندیدہ معلوم ہوتی تھیں انھوں نے مشورہ دیا کہ "اب تک تو تم نے بناؤ سنگار کرتی رہیں اب ذرا گھر کی طرف توجہ کرو اسکو سجا بنا کر رکھو اور دیکھو کہ میاں کیا کہتے ہیں" بیوی نے سوچا چلو یہ بھی کر دیکھوں، چنانچہ سارا دن محنت کر کے گھر کی صفائی کی سلیقے سے سجایا اور خود صاف مگر ہلکے پھلکے کپڑے پہن کر میاں کا انتظار کرنے لگیں گھر میں قدم رکھتے ہی میاں نے جو رنگ دیکھا تو نقشہ ہی دوسرا تھا بے اختیار بیوی کی بلائیں لے لیں اور بولے "ہاں آج تم بن کر بیٹھی ہیں!! کیا لئے بہت حسین لگ رہی ہو"

میاں کو یوں بے اختیار داد دینے پر مجبور کرتے والا جوہر بیوی کے اندر جاگا ہوا یہی احساس جمال کارفرما تھا۔

احساس جمال کوئی لیکر پیدا ہوتا ہے یعنی خداداد ہوتا ہے اور کوئی دوسروں کو دیکھ کر اپنے میں پیدا کرتا ہے اور کسی کو سمجھنے کی ضرورت پڑتی ہے

ہر عورت کے تصور میں اسکا اپنا ایک گھر ہوتا ہے اور اس تصور کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں اسکی آرائش کا ایک خاکہ تیار ہونے لگتا ہے کیونکہ یہ عورت کا فطری جذبہ ہے اور گھر تو ہر حال گھر ہوتا ہے چاہے وہ جھونپڑی ہو یا محل اگر فرق ہوتا ہے تو اس کے رکھ رکھاؤ میں کسی گھر کی بے ترتیبی اور گندگی طبیعت کو مکدر کر دیتی ہے اور ایک چھوٹی سی کٹیا سامانِ مسرت مہیا کر دیتی ہے کیونکہ اس میں نمائش نہیں ہوتی بلکہ ذوق نظر کا اہتمام ملتا ہے۔ یہ سادگی اور پرکاری ہی کا طفیل ہے جو گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔

زندگی کے چلن میں شادی بیاہ رسم و رواج اور آپسی میل جول یعنی سماجی زندگی کا بڑا دخل ہے شادی ہی کو لے لیجئے۔ شادیوں میں دھوم دھڑکے اور نمود و نمائش کی بھرمار ہوتی ہے صاحب حیثیت تو شاید ایسی شادی سے خوش ہو بھی لیتے ہوں لیکن متوسط طبقہ لاکھوں کی شادی رچا کر وقتی مسرت کا سامان کچھ لیتا ہے لیکن قرض کی ادائیگی اور گھر کی دوسری ذمہ داریوں کی فکر اس وقتی مسرت کو دائمی عذاب میں بدل دیتی ہیں شادی جیسے متبرک فریضے کی ادائیگی میں اگر توازن اور اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے تو خوشی کا وہ احساس جو جینے کا حوصلہ عطا کرتا ہے کبھی ماند نہ پڑے میرا خیال ہے کہ سامان کم قیمت ہی سہی لیکن اگر وہ نفاست اور ذوق جمال کا مظہر ہے تو زیادہ پرکشش اور دل خوش کن ثابت ہو سکتا ہے۔

یوں تو رسومات بجائے تفریح طبع کے اگر قرض کی شکل اختیار کر لیں تو اپنا حسن کھو دیتی ہیں بعض رسومات جس بھونڈے انداز میں ادا کی جاتی ہیں کاش وہ ترک کر دی جاتیں۔ چھٹی چھلے کی رسومات ان میں سے ایک ہے چند دن کی ننھی سی جان پر کیا کچھ نہیں لادا جاتا گوٹے کے کپڑوں کی چبھن سے بچہ بلبلا کر رہ جاتا ہے کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی بلکہ قرینہ پھولوں میں جکڑ دیا جاتا ہے اس طرح بزرگوں کا شوق و ارمانوں کا تختہ مشق بن جاتا ہے اور یہ تمام رسومات اسقدر عقیدت کے ساتھ انجام دی جاتی ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر تمام رسومات ادا نہ ہوئیں تو خدا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہینگے بڑوں کے اس شوق کو نمائش اور دکھاوے کے سوا کوئی

بہت پچھتائے فیشن کر کے

بظاہر بات بہت معمولی سی تھی۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ کبھی کبھی ذرا سی بات بھی بتنگڑ بن جاتی ہے۔ اور فیشن کی بات تو کچھ ایسی نہ تھی کہ جس میں کسی حادثے کے رونما ہونے کا اندیشہ ہو۔ لیکن یہ قسمت کا لکھا تھا کہ ہمارے لئے فیشن نے بھی حادثہ کی شکل اختیار کر لی۔

ایسا تو نہیں ہے کہ ہم نے کبھی فیشن کا نام ہی نہ سنا ہو یا کسی کو فیشن کرتے نہ دیکھا ہو لیکن جس ماحول میں ہمارا بچپن گذرا اور جس ڈھنگ سے ہماری تربیت ہوئی اس کے نقش کچھ اس قدر گہرے ہیں کہ آج کے ماحول میں ہم ان اصولوں کو تلاش کرتے ہیں تو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اب یہی دیکھئے نا اُس زمانے میں بھی فیشن کیا جاتا تھا لیکن اس کے کچھ اصول ہوا کرتے تھے مثلاً عمر اور حالات کے لحاظ سے کچھ حصوں میں تقسیم تھا۔ شادی شدہ اور ان بیاہی لڑکیوں کے فیشن میں اتنا نمایاں فرق تھا کہ آپ بہ آسانی اُن دونوں میں تمیز کر سکتی تھیں۔ (کیا آج کل یہ ممکن ہے؟ نہ جانے آپ کا کیا تجربہ ہے مجھے تو کئی بار شرمندگی اٹھانی پڑی۔ ایک بار میں نے ایک بیگم صاحبہ کو لڑکی سمجھ کر ایک لڑکے کے لئے نشاندہی کر دی تھی) اسی طرح جب بچے برابر کے ہو جاتے تھے تو ماؤں میں بھی مزاج کی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ بناؤ سنگھار میں بھی ایک بردباری اور وقار پیدا ہو جاتا تھا (لیکن آج کل کی تو دنیا ہی نرالی ہے فیشن نے چھوٹے بڑے کا فرق ہی مٹا دیا اگر آپ ساس اور داماد کو دیکھیں تو سالی بہنوئی ہی کا دھوکہ ہو گا۔

تو بھئی ہم نے پرانے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور پرانا طریقہ ہماری آنکھوں میں بسا تھا اسی لئے ہم اپنی جگہ پوری طرح مطمئن تھے کہ فیشن میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کیا ہوا کہ زمانہ بہت آگے نکل گیا اور ہم بیچارے ساتھ چلنے کے اس کے پیچھے گھسٹنے لگے اور ایسا محسوس ہوا کہ ہم زمانے کے ساتھ کبھی تھے ہی نہیں!! اب جو ذرا حواسوں کو درست کر کے زمانے پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہیں جہاں سے چلے تھے یعنی فیشن کا سایہ بھی ہم پہ نہ پڑا تھا وہی تیل لگے بالوں کی تنگ چوٹی، ہاتھوں میں چوڑیاں

بی جمالو

حالات زندگی لکھے جائیں تو پھر لے کر تاریخ پیدائش سے تاریخ وفات اور مقام وفات تک ہی لکھیں لیکن بی جمالو کے لئے کوئی کہاں سے یہ شرطیں پوری کرے ان کی تاریخ پیدائش سرے سے کسی کو معلوم ہی نہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ دنیا کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے بھی جنم لیا ہوگا رہی وفات کی بات تو اللہ نہ کرے دشمنوں کے کان بہرے۔ بس یوں سمجھیے کہ قیامت کے بور یئے یہی سمیٹیں گی۔ ذات پات سے تو ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان بیچاری کے خاندان کا بھی کوئی اللہ کا بندہ آج تک تصفیہ نہ کر سکا کہ آخر ہیں یہ کس کھیت کی مولی مگر کوئی کچھ بھی کہے میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ ہو نہ ہو ان کا رشتہ ذات شریف سے ضرور ہے اور کیا عجب کہ انھیں کی اولاد سے ہوں۔ میں نے یہ اندازہ ان دونوں کے مزاجوں کی یکسانیت سے لگایا ہے۔

ان کی عمر کا اندازہ لگانا بھی خاصا مشکل کام ہے بھی کوئی عمر ہو تو بتائی بھی جائے یہ تو ٹھہریں سدا بہار البتہ سوانگ بھرتی رہتی ہیں موقعہ اور وقت کے لحاظ سے جس بھیس میں چاہیں دیکھ لیجیے اور اگر پوری دنیا میں نہیں تو کم از کم ہندوستان کے ہر خاندان میں یہ پائی جائیں گی کہیں دھوبن ہیں تو کہیں مہترانی کسی گھر میں ماما ہیں تو کہیں استانی پھر دیکھیے تو ساس، بہو، نند، بھاوج، دیورانی، جیٹھانی جیسے نازک رشتوں میں ان کا موجود رہنا لازمی ہے اور آگے بڑھیے تو دوست احباب اور محلہ والوں میں بھی کسی نہ کسی روپ میں نظر آئیں گی بس یہ سمجھ لیجیے کہ شیطان کے بعد ان کا دوسرا

پھونک پھونک کر بجھاتی ہیں کہ آگ بجھتی نہیں بلکہ رخ پلٹ دیتی ہے اور بی جمالو صاف بچ نکلتی ہیں یہ ان کی پھونک کا کرشمہ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے ہاں تو صاحب جب بی جمالو کی بات چل ہی پڑی ہے تو کیا ضروری ہے کہ پیدائش سے ہی بات شروع ہو اخراو معاف۔ بھی تو کچھ قیمت رکھتے ہیں انھیں پہ کچھ روشنی پڑ جائے تو کیا برائی ہے۔

آگ لگانا تو ان کا مشغلہ ہی ٹھیرا ایک بڑی خوبی بھی ہے وہ ہے منافقت۔ یہ جو ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی اور خود منافق ہیں چنانچہ ہر ایک کو اپنا جیسا ہی سمجھتی ہیں اور منافقت کا بھونڈا لباس پہن کر اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ گویا اس سے بہتر کوئی لباس نہیں۔ جب آپ سے ملیں گی تو جتنی دیر آپ کے ساتھ رہیں گی آپ پر صدقے اور قربان ہوتی رہیں گی اور بیٹھ پیچھے آپ کی پشتوں تک کو اس طرح گن کر رکھ دیں گی گویا آپ کے جدِ اعلیٰ ان کی بیٹی کے نیچے پیدا ہوئے تھے انکا دل بھی بہت کمزور ہوتا ہے منہ پر سچی اور صاف بات کرنے سے ہمیشہ کتراتی ہیں ہماری آپ کی خبریں جن سے ہم خود واقف نہیں بی جمالو کی زبانی آپ کو دوسروں سے معلوم ہوں گی اور پہلی بار آپ کو اپنی کمزوریوں کا پوری طرح احساس ہوگا اور بعض ایسی باتوں کا انکشاف ہوگا کہ آپ حیران ہو جائیں گے میں تو کہتی ہوں بی جمالو کی ان مہربانیوں کا شکر گذار ہونا چاہیئے کیوں کہ بھئی بدنام بھی ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!!!

یہ جھوٹ بڑی معصومیت سے بولتی ہیں اگر کسی نے اپنی عزت کو خطرے میں ڈال کر پوچھ لیا کہ بھئی تم نے فلاں بات جھوٹ کیوں کہی تو بڑی معصومیت سے جواب ملے گا "اے ہے اللہ قسم' ایمان سے مجھے یاد نہیں مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے تو خود جھوٹ سے نفرت ہے" وغیرہ وغیرہ اب بی جمالو کا کچھ بگاڑ سکیں تو بگاڑ کر بتائیے "بھول" کے خوبصورت بہانے میں بات بھینی چلی گئی اور بی جمالو معصوم صورت بنا کر بہتان لگانے

والوں کو کود یھیلا پھیلا کر کوستی رہیں گی۔ اور جب ان کے پاس سے اٹھے تو دل میں یہ خیال
کہ شاید بی جمالو سچ ہی کہتی ہوں گی جھوٹ تو بیچاری جھگڑے کو ختم کرنے کی نیت سے
بولتی ہیں لیکن اب زبردستی جھگڑا طول پکڑ جائے تو یہ کیا کریں یہ طبیعتاً بڑی جل ککڑ تی واقعہ
ہوئی ہیں کسی کی اچھی تعریف تو یہ ہضم کر ہی نہیں سکتیں تو بھلا شہرت کہاں سے برداشت
ہوگی بس صبح سے شام تک جلاپے کی آگ میں جلتی رہتی ہیں ان کے خاندان کی یا پہچان والے
کی جہاں چار لوگوں نے تعریف کی کہ انھوں نے عیب گنانے شروع کئے کسی کے عیبوں
کو تلاش کرنا اور خوبصورتی سے ان کا بیان کرنا بی جمالو ہی کا حصہ ہے میں بھی اس کی قائل
ہوں کہ آدمی بات کرے تو ایسی کہ کم از کم اس کا کچھ اثر سننے والے پر تو ہو یہ خوبی بی جمالو
میں ہے کہ بی جمالو کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بہت ہی دیرپا اثر رکھتا ہے اور
اس اثر کو زائل کرنے کے لئے لوگوں نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں بلکہ کبھی تو عمریں گذار دی ہیں
بی جمالو جاہلوں میں جاہل اور تعلیم یافتہ طبقہ میں نہایت تعلیم یافتہ شخصیت نظر آتی ہیں
جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں یہ اپنے موقعہ اور وقت سے پورا فائدہ اٹھاتی ہیں جاہلوں میں
بیٹھینگی تو خود بھی اسی رنگ میں نظر آئیں گی اور ایسے انداز سے چنگاری پھینکیںگی کہ اللہ دے
اور بندہ لے اگر تعلیم یافتہ طبقہ میں جلوہ افروز ہوں گی تو ایسی فلسفیانہ اور منطقیانہ ڈھنگ
سے زہر گھولیں گی کہ آپ ششدر رہ جائیں اور جب زہر پوری طرح چڑھ جائیگا تو یہ نہایت
دلیرانہ لہجے میں اِسبات کا اعلان کریں گی کہ آپ لوگ پڑھے لکھے ہوکر جاہلوں جیسی ذہنیت
رکھتے ہیں اور آپ بی جمالو کے زہریلا ڈنک مار کر بھی ان کو نہ بلبلانے پر مجبور کر دیں گی
اور یہی گویا ان کی کامیابی ہے۔

اگر بی جمالو کو کسی میں خوبی نظر آتی ہے تو وہ صرف ان کی اولاد ہے اس کی کوئی کمزوری
ان کو دکھائی نہیں دیتی اور یہ خوبی بی جمالو کے یہاں خاندان در خاندان چلتی ہے جس کا نتیجہ
یہ ہے کہ سگی بہنوں کی اولاد بھی آپس میں ایک دوسرے میں کیڑے نکالنے لگتی ہے بی جمالو

جب خود صاحب اولاد ہو جاتی ہیں تو گویا ان کے نزدیک جتنی مائیں ہیں وہ سب ناکارہ ہیں کسی میں نہ ماں بننے کی صلاحیت ہے نہ بچے کی پرورش کے گُر سے واقف ہیں یہ اوصاف تو صرف بی جمالو میں ہے کہ جس کے بچے کچھ تو ذات شریف اور کچھ بی جمالو کے نقش قدم پر چل کر بی جمالو کے نام کو زندہ رکھتے ہیں۔

بہر حال بی جمالو سے چاہے کسی کو کتنی ہی شکایت ہو ہم ان پر کوئی الزام نہیں رکھنا چاہیئے دنیا کی نظر میں میں نے مانا کہ بی جمالو کی حرکتیں ایسی نہیں کہ ان کو معاف کیا جائے مگر میں کہتی ہوں کہ کبھی ان کے دل کو دیکھئے آخر ان کو پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا کہ وہ خواہ مخواہ جھگڑے کرواتی پھریں ہیں تو پھر یہی کہوں گی کہ وہ دل سے مجبور ہیں وہ تو سب کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں دوسروں کی خوشی ان کی خوشی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ خاندانوں میں خوشی کو دائمی شکل دینا چاہتی ہیں اور ہوتا یہ ہے کہ ان کے دخل در معقولات سے اچھے دل برے ہو جاتے ہیں اور اطمینان و سکون ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتا ہے۔ ادھر کی بات ادھر ضرور کہتی ہیں لیکن بری نیت سے نہیں۔ وہ تو صرف بات کو پر اثر بنانے کے لئے سچ میں جھوٹ کی چاشنی دینا چاہتی ہیں اور اتفاق کچھ ایسا ہوتا ہے کہ جھوٹ کی آمیزش زیادہ ہونے سے بجائے چاشنی کے تلخی پیدا ہو جاتی ہے ارے صاحب آخر ساری ذمہ داری ان پر ڈالی ہی کیوں جاتی ہے ان کی بات سن کر کچھ اپنی عقل بھی استعمال کیجئے جب کانوں کی کچے ہوں گی تو بی جمالو تو اس طرح تگنی کا ناچ نچاتی رہیں گی۔

نمبر ہے۔ شیطان تو استغفار پڑھنے سے بھاگ بھی جاتا ہے لیکن ان پر کسی منتر کا بھی اثر نہیں ہوتا۔

ذات شریف تو اپنے نام ہی سے اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں لیکن بی جمالو خدا جانے کس علت میں مشہور ہو گئیں۔ بات یہ ہے کہ وہ جو شاعر نے کہا ہے نا کہ "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" بس وہی معاملہ بی جمالو کا بھی ہے ان سے کسی کا دکھ درد دیکھا نہیں جاتا جب دیکھو کسی نہ کسی کے درد میں مبتلا ہیں۔ ہر ایک کی ہمدردی میں دبلی ہوئی جاتی ہیں اب یہ اور بات ہے کہ ان کی ہمدردی کا ڈھنگ کچھ دنیا سے نرالا ہے اپنے نزدیک تو یہ غم گساری کرتی ہیں لیکن بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے اس کو بدنصیبی ہی کہئے کہ نیکی کریں اور گناہ لازم آجائے۔ حالانکہ بقول بی جمالو کے کہ "میرا اللہ جانتا ہے میں نے تو اپنی محبت اور خلوص میں ہمدردی کی تھی مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہمدردی بھس میں چنگاری کا کام دے گی" غریب کئی بار توبہ کر چکی ہیں کہ آئندہ کسی کے پھٹے میں پاؤں نہ ڈالینگی لیکن کیا کریں دکھیا دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جب ان سے بیوی کی طرف سے میاں اور ساس کی طرف سے بہو کی بے تو جہی نہیں دیکھی جاتی تو منہ سے کچھ نہ کچھ نکل ہی جاتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ان کے دل کو کیوں نہیں دیکھتے بس ان کی زبان سے کئے ہوئے ہر لفظ کو غور سے سنتے ہیں اور آپس میں جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ ان غریب کو تو جھگڑوں سے سخت نفرت ہے خود ہی کہتی ہیں کہ لڑائی جھگڑوں سے ان کا جی کانپتا ہے پھر نہ جانے یہ کس طرح ہر جھگڑے میں کھینچی کھینچی پھرتی ہیں۔! اور جب ان کی کھنچائی شروع ہوتی ہے تو ایسی واویلا کریں گی ایسی دہائیاں دیں گی کہ آپ خلوص کو ماننے پر مجبور ہو جائیں گی اور بی جمالو پھر دھوبی بیٹا چاند کے مصداق نظر آئے گی۔ بھس میں چنگاری ڈالکر دور سے سلگنے کا تماشا دیکھنا بی جمالو کا بہت ہی دلپسند مشغلہ ہے اور آگ کے رخ کو موڑنا ان کے فن کا کمال ہے جب چنگاری سے بھس میں شعلے بلند ہونے لگیں اور اتفاق سے بی جمالو کے دامن کو آلیں تو ایسی خوبصورتی سے

نام سے مخاطب کرتا ہے خوش اخلاق اور محنتی لوگ ہیں مگر عزت کو دھکا نہیں لگنے دیتے۔ مالک کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے اور جی حضوری کرنے کا وہاں تصور بھی کیا جانا ناممکن ہے کاش ہمارے یہاں بھی ایسا ماحول پیدا ہو جائے۔ غرض یہ کام سے پیچھے نہیں ہٹتے اسی لئے یہاں کوئی بھوکا نہیں رہتا اور اگر کچھ دن بیکار رہنا بھی پڑے تو سرکار کی طرف سے مالی امداد ملتی رہتی ہے وہاں کی خوش حالی کے دو بڑے سبب یہی ہیں کہ آبادی کم ہے اور کام میں چیاں چنیں نہیں کرتے وہاں عزت انساں کی کی جاتی ہے عہدوں کی نہیں!

تعلیمی نظام بھی مجھے بہت پسند آیا۔ پانچ سال کی عمر سے بچے کا اسکول شروع ہوتا ہے۔ ہائی اسکول تک تعلیم ضروری اور مفت ہے بچے پر انفرادی توجہ دی جاتی ہے غیر معمولی بچوں کی ذہانت کو جلا بخشنے کیلئے پورے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات کہ ان کی ننھی جانوں کی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ نہیں لادا جاتا۔ معذور بچوں کیلئے ان کی معذوری کے لحاظ سے اسکول کھولے گئے ہیں جہاں ان کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ تم بھی عام انسانوں جیسی زندگی گذار سکتے ہو زیادہ تر اسکول کے بچے ہی شام کے وقت اخبار تقسیم کرنے کا کام کرتے ہیں اور جو کمیشن ملتا ہے اپنے شوق کی چیزیں خریدتے ہیں۔

ہائی اسکول کے بعد اکثر بچے پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ کالج کی تعلیم بہت مہنگی ہے کالج تک وہی بچے پہنچ پاتے ہیں جن میں علم کی لگن ہو ایسے بچے دن میں کام کر کے رات کے کالج میں شریک ہوتے ہیں یعنی اپنی تعلیم کا خرچ خود ہی اٹھا لیتے ہیں یا پھر غیر معمولی صلاحیت کے حامل طالب علم کو حکومت اپنے خرچ سے تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں آپکو عورت مرد کے شانہ بہ شانہ نظر آئیگی۔ تعلیمی اعتبار سے بھی اور ملازمتوں میں بھی دکانوں، دفتروں، اسکولوں اور ہسپتالوں میں جہاں عورت مختلف حیثیتوں میں نظر آئیگی۔ وہ ایسے کام کرتے بھی دکھائی دیگی جس کو ہم ہندوستانی صرف مرد کا حصہ سمجھتے ہیں مثلاً بسیں ٹرک اور بڑی بڑی مشینیں بھی عورت مرد ہی کی طرح چلاتی ہے کینیڈین عورت بہت مضبوط، بے حد محنتی اور خود اعتمادی کے نشے میں سرشار رہتی ہے کسی کی دستِ نگر رہنا پسند نہیں کرتی قانون